خوفِ خدا
محی الدین نواب

خوفِ خدا

زبان سے خوف خدا کا اظہار کرنے اور عمل سے انکار کرنے والے دوغلے لوگوں کی کہانی۔

خود غرض اور بے حس لوگوں کا قصہ جو دوسروں کی خوشیاں چھین کر اپنی محرومیوں کا ازالہ کرتے ہیں۔ تلخ حقائق سے بھاگنے والے فریب خوردہ انسانوں کی کہانی جو انسانی شناخت کھو بیٹھے ہیں۔

ہر شخص کی زندگی میں ایسے خوش نصیب لمحات ضرور آتے ہیں' جب وہ عورت کے لئے زمین اور دولت کے لئے اپنے مقدر کے دروازے خود اپنے ہاتھوں سے کھولتا ہے۔ میں نے دروازہ کھولا تو کمرے سے گلابوں کی مہک آئی۔ کمرا دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ وہ دلہن بنی پھولوں کی سیج پر بیٹھی ہوئی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر سمٹ رہی تھی۔ میں دھڑکتے ہوئے دل سے سہاگ کے کمرے میں پہلا قدم رکھنے ہی والا تھا کہ ہادی نے کہا۔ "خدا کا خوف کھا۔ رک جا۔"

میں نے پوچھا۔ "بھلا اس میں خدا کا خوف کھانے کی کیا بات ہے میں نے شادی کی ہے۔ باقاعدہ نکاح پڑھوایا ہے۔ اب یہ میری دلہن ہے۔"

ہادی نے کہا۔ "یہ میری بھی دلہن ہے' میں نے بھی اس کے ساتھ باقاعدہ نکاح پڑھوایا ہے' یہ بے چاری معصوم ہے' انجان ہے' تمہارے فراڈ کو نہیں سمجھتی ہے۔ میں تمہیں اس کمرے میں جاکر اس کی معصومیت سے کھیلنے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"دیکھو ہادی' میں مسلمان ہوں۔ تمہاری طرح میں بھی ایمان والا ہوں۔ میں نے اس لڑکی کو مجبور نہیں کیا ہے' یہ راضی خوشی دلہن بن کر میرے کمرے میں آئی ہے۔"

ہادی کی عادت ہے ہر لمحہ ہدایت دینے لگتا ہے۔ کہنے لگا۔ "ہم کس مقام پر ہیں' ہم اپنے فائدے کے لئے اپنے مذہبی اصولوں کو' اپنے مذہبی قوانین کو اور مذہبی احکامات کو توڑ مروڑ کر ایک ایسی شکل دے دیتے ہیں جسے دیکھ کر یہ معلوم تو ہوتا ہے کہ یہ اسلام کا چہرہ ہے مگر اندر سے کس طرح بگاڑ دیا گیا ہے' اوپر سے معلوم نہیں ہوتا۔ اب اپنی شادی کو لے لو۔ تم نے باقاعدہ نکاح پڑھوایا ہے' اس میں کوئی شبہ نہیں لیکن اس کے پیچھے تمہارا کتنا بڑا فراڈ چھپا ہوا ہے' یہ نکاح پڑھانے والا قاضی نہیں جانتا تھا وہ بزرگ نہیں جانتے تھے جو تمہاری شادی میں شریک ہوئے تھے۔ وہ محض یہی دیکھ

کر مطمئن ہو گئے کہ تمہارا اور اس لڑکی کا نکاح شریعت محمدیؐ کے مطابق ہوا ہے' میں اس کا مجازی خدا ہوں' یہ میری شریکِ حیات ہے تم کمرے سے باہر رہو گے' میں کمرے کے اندر جاؤں گا۔"

بڑی مشکل ہے' یہ ہادی اکثر میرے لئے مشکلات پیدا کرتا ہے۔ میں وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ میرا پورا نام غلام حسین ہادی ہے' یہ ہادی والی مصیبت میرے نانا نے میرے پیچھے لگائی ہے۔ جب میں پیدا ہوا تو میرے دادا جان نے میرا نام غلام حسین رکھا۔ میرے نانا نے کہا۔ "میں نے اس بچے کی تاریخ پیدائش اور اس کے ستارے دیکھ کر کلام پاک سے اس کا نام نکالا ہے' اس کا نام ہادی ہونا چاہئے۔"

دادا جان نے کہا۔ "تم نے اپنی لڑکی بیاہ کر میرے گھر بھیج دی۔ میرے گھر میں جو ہو گا میرے رسم ورواج اور میرے مزاج کے مطابق ہو گا۔ مجھے یہ نام پسند ہے' اس لئے میں اس کا نام غلام حسین رکھ رہا ہوں۔" تب میرے والد نے میرے نانا اور دادا جان سے کہا۔ "ایک دوسرے کی مخالفت کرنے سے کیا ملے گا خواہ مخواہ کشیدگی بڑھے گی لہٰذا دونوں ہی نام رکھ لئے جائیں۔ اس کا نام غلام حسین ہادی مناسب رہے گا۔"

میرے نانا جان نے کہا۔ "ہم مسلمانوں کو خوب سوچ سمجھ کر نام رکھنا چاہئے۔ میں مانتا ہوں کہ کسی بچے کا نام ایمان علی رکھنے سے وہ ایمان والا نہیں ہو جائے گا لیکن جب بھی وہ غلط راستے پر چلے گا یا کوئی برائی کرے گا' جھوٹ بولے گا تو اس بات سے خوف کھائے گا کہ لوگ اسے ایمان علی کے نام سے جانتے ہیں لہٰذا وہ لوگوں سے ڈرے گا۔ عام طور پر آدمی اللہ سے نہیں بلکہ آس پاس کے بندوں سے ڈرتا ہے۔ کوئی بات نہیں آدمی بندوں سے بھی ڈرے یا اپنے نام کی شرم رکھنے کے لئے محتاط رہے' عمل میں یہی احتیاط بندے کو اللہ کی طرف لے جاتی ہے۔"

نانا جان نے دعویٰ کیا۔ "میرا نواسا جب بھی کوئی غلط کام کرے گا' کسی غلط راستے پر چلے گا تو یہ ہادی اسے سمجھائے گا' اسے نیک ہدایات دے گا۔ کوئی ضروری نہیں کہ میرا نواسا اس ہدایت پر عمل کرے اور صالح مرد بن جائے لیکن کچھ تو اس پر اثر ہو گا اور اگر اثر نہ بھی ہو تو میں اس بچے کا نانا ہوں اور میں اپنی تسلی کے لئے اس کا نام ہادی رکھ رہا ہوں۔"

وہ دن ہے اور آج کا دن' یہ ہادی میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں نے کھلے ہوئے دروازے سے سیج پر سمٹی ہوئی دلہن کو دیکھا پھر کہا۔ "میرا پیچھا چھوڑ دو' مجھے جانے دو۔"

اس نے کہا۔ "ہادی جبر نہیں کرتا' صرف ہدایات دیتا ہے۔ عمل کرنا یا نہ کرنا تیری مرضی ہے لیکن ایک بات اچھی طرح سن لے۔ میں تیرے ساتھ دلہن کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اس فراڈ میں شریک نہیں رہوں گا یوں سمجھ لے کہ بے چاری کا نکاح غلام حسین ہادی سے نہیں صرف غلام سے ہوا ہے۔"

میں نے جلدی سے کمرے میں قدم رکھا' دروازے کو اندر سے بند کیا' اب غلام اندر اور ہادی باہر تھا۔

میں نے دلہن کو دیکھا۔ وہ گھونگھٹ میں تھی' مجھے نہیں دیکھ رہی تھی لیکن اور زیادہ سمٹ رہی تھی۔ ایسے وقت دلہن کانوں سے سنتی بھی ہے اور آنکھوں سے دیکھتی بھی ہے وہ پہلی آہٹ پر سمجھتی ہے' دروازہ کھلا ہے پھر دوسری آواز پر سمجھ لیتی ہے' دروازہ بند ہوا ہے۔

میں گھونگھٹ تک پہنچ گیا۔ گورے گورے حنائی ہاتھ بتا رہے تھے کہ وہ بہت خوبصورت ہے۔ ویسے اماں جان نے بتایا تھا کہ لڑکی نہایت خوبصورت ہے اور باجی جان نے کہا تھا۔ "خبردار' دیوانے عاشق نہ بن جانا' صرف شوہر بن کر رہنا۔"

میں نے اس کے حنائی ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھا' وہ ذرا سا کسمسائی۔ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "ابھی ہم آج......... اج.......... اج اجنبی ہیں مگر صبح ہونے تک ایک جان دو قالب ہو جائیں گے۔"

جیسے شرمیلی دلہنیں چپ رہتی ہیں ویسے وہ بھی چپ تھی۔ پتا نہیں میرے ہکلانے پر کیا سوچ رہی ہو گی۔ شادی سے پہلے جب بڑی بوڑھیاں کہیں لڑکیاں پسند کرنے جاتی ہیں تو اسے اچھی طرح ٹٹول کر دیکھ کر سمجھ کر پسند کرتی ہیں۔ اس کی آواز کو سنتی ہیں کہ کہیں وہ ناک سے تو نہیں بولتی۔ کوئی لڑکوں کو اس طرح بکاؤ مال سمجھ کر نہیں ٹٹولتا۔ لڑکا جیسا بھی ہو' پسند کر لیا جاتا ہے۔ اگر لڑکی والوں کی طرف سے کوئی مجھے پسند کرنے آتا تو پتا نہیں اس وقت میری پوزیشن کیا ہوتی کیونکہ میں سچ مچ ہکلاتا نہیں ہوں میرے

لہجے میں مردانگی ہے۔ میں تحت اللفظ میں بڑی عمدگی سے اشعار پڑھتا ہوں اور بہت اچھی طرح گیت بھی گاتا ہوں۔ یہ تو باجی جان نے حکم دیا تھا۔ "خبردار صحیح آواز اور لب و لہجے میں دلہن سے گفتگو نہ کرنا' ورنہ دیوانے عاشق کی طرح بولنے لگو گے' جب بھی اس کے پاس جاؤ' ہکلا کر بولو۔"

میں نے اس کے ایک حنائی ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ "میرا خیال ہے تم میرے ہکلانے پر گھوں............ گھوں............ گھونگھٹ کے پیچھے ہنس رہی ہو۔ کوئی بات نہیں' ہنسنا ہر انسان کا حق ہے۔ ہنسنا ضرور چاہئے لیکن کسی کا مذاق نہیں اڑانا چاہئے۔"

اس نے ہولے سے انکار میں سر ہلایا۔ کہنا چاہتی تھی کہ وہ مذاق نہیں اڑا رہی ہے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے گھونگھٹ کو تھام لیا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لیا۔ میں نے ابھی منہ دکھائی کی رسم ادا نہیں کی تھی لہٰذا جیب سے سونے کا ایک لاکٹ نکال کر کہا۔ "یہ حسن کی خدمت میں سونے کے لاکٹ کا نذرانہ ہے لیکن جب تک گھونگھٹ نہیں اٹھاؤ گی تمہاری گر............ گر............ گردن نظر نہیں آئے گی تب تک لاکٹ کیسے پہناؤں گا؟"

میں نے گھونگھٹ اٹھا دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ کو چھپا لیا۔ میں نے پہلے اس کے گلے میں لاکٹ پہنایا۔ پھر اس کے ہاتھوں کو چہرے سے ہٹایا۔ کتنا حسین چہرہ تھا میرے نام جیسے حسن کی لاٹری نکل آئی تھی۔ میں سحر زدہ سا ہو کر جانے کتنی دیر تک اسے دیکھتا رہا' کچھ بولنا ہی بھول گیا اور جب بولنے پر آیا تو بولتا ہی چلا گیا۔ "مہناز! تمہارا نام تمہارے حسن کے عین مطابق ہے' تم واقعی مہناز ہو' میں تم پر ناز کرتا ہوں۔ مجھے شاعری سے لگاؤ ہے' میں حسن کو چاند اور جوانی کو کنول نہیں کہوں گا کیونکہ تم اس کی طرح نہیں ہو بلکہ چاند تم سے حسن چراتا ہے اور کنول تمہاری جوانی کی بھیک مانگتا ہے۔ آج میں شاعری اور حسن کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہا ہوں اور سمجھ رہا ہوں۔ جی چاہتا ہے تمہیں دیکھتا ہی چلا جاؤں۔"

میں نے ہتھیلیوں کے گلدان میں اس کے پھول جیسے چہرے کو سجا لیا تھا۔ اچانک اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں اتنی دیر سے بول رہا تھا اور ہکلانا بھول گیا تھا۔ باجی جان

نے ٹھیک ہی سمجھایا تھا کہ شوہر بن کر رہنا' دیوانے عاشق نہ بن جانا لیکن کسی کے سمجھانے سے کیا ہوتا ہے۔ حسن سحر پھونک رہا تھا۔ میں دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اپنے وجود کو بھول چکا تھا پھر ہکلانا کیسے یاد رہتا۔

میں نے مہناز کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ کہیں اس نے میری یہ غلطی پکڑ تو نہیں لی؟ لیکن وہ خلا میں تک رہی تھی۔ میں اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں کی تعریف کرنا چاہتا تھا۔ اچانک ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' تب میں نے سمجھ لیا کہ اسے کس بات کا دکھ ہے۔ میں اس کے حسن کے ایک ایک جلوے کو' ایک ایک پہلو سے دیکھ سکتا تھا لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

کیونکہ وہ اندھی تھی۔

☆------☆------☆

میری باجی جان مجھے بہت چاہتی ہیں۔ کبھی مجھے نظروں سے دور نہیں ہونے دیتیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کے ساتھ جہیز میں آیا ہوں۔ جو لوگ مجھ سے جلتے ہیں' وہ طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ مجھے ہڈ حرام کہتے ہیں' ان کا خیال ہے' میں کام چور ہوں' محنت نہیں کرنا چاہتا' اسی لئے بہن کے گھر اپنے نصیب کے ٹکڑے توڑ رہا ہوں۔

کوئی دو برس پہلے مجھے ایک لڑکی بہت پسند آئی تھی۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ آخر ایک روز میں نے فون پر اسے مخاطب کیا اور اپنے دل کی بات کہہ دی۔ "ہیلو شکیلہ! میں بہت دنوں سے اپنے دل کی بات کہنا چاہتا ہوں لیکن جرأت نہ کر سکا۔ آج فون پر کہنے کا حوصلہ ہو رہا ہے' تم برا تو نہیں مانو گی؟"

"اگر برا مانوں گی تو تمہیں فون پر نظر نہیں آئے گا۔ چلو بولو' کیا بات ہے؟"

"میں تم سے محبت کرتا ہوں' تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "بھلا یہ بھی کوئی برا ماننے والی بات ہے۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے لیکن میں نے سنا ہے تم بہن کے ہاں رہتے ہو۔ وہیں کھاتے پیتے ہو' کوئی کام نہیں کرتے۔"

"کام کی کیا ضرورت ہے' میں اپنے بہنوئی کا کاروبار سنبھالتا ہوں۔"

"تم اور کاروبار سنبھالتے ہو! برا نہ ماننا میں نے تو سنا ہے' تم بہنوئی کے کپڑے دھوتے ہو' استری کرتے ہو' جوتے پالش کرتے ہو' تمہاری بہن اور بہنوئی کہیں آتے جاتے ہیں تو تم گاڑی ڈرائیو کرتے ہو۔"

"وہ مجھ سے بڑے ہیں۔ یہ چھوٹوں کا فرض ہے کہ وہ بڑوں کا ہر کام کیا کریں۔"

"میں بھی اپنے بڑوں کا کہنا مانتی ہوں' وہ جو کہتے ہیں' وہ کرتی ہوں۔ جانتے ہو' وہ کیا کہتے ہیں؟"

"کیا کہتے ہیں؟"

"یہی کہ ساس کے گھر داماد کتا' بہن کے گھر بھائی کتا۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ میرے منہ پر جیسے تھپڑ پڑا تھا میں نے گھور کر ریسیور کو دیکھا پھر اسے پٹخ دیا۔ یہ دنیا والے کسی کی خوشحالی دیکھ نہیں سکتے۔ بہن محبت کرے اور ماں بن کر اپنے سائے میں رکھے تب بھی طعنے دیتے ہیں۔ یہ بات ہرگز درست نہیں تھی کہ میں بہنوئی کے جوتے پالش کرتا ہوں۔ ایک بار ہم کسی تقریب میں جا رہے تھے' میں اپنے جوتے پالش کر رہا تھا۔ ملازم کسی کام میں پھنسا ہوا تھا۔ اسے آنے میں دیر ہو رہی تھی۔ میں نے بہنوئی کے بھی جوتے پالش کر دیئے۔ جانے کیسے بات کا بتنگڑ بن جاتا ہے۔ ایک ہی گھر میں رہ کر سب ہی ایک دوسرے کا کام کرتے ہیں اس سے کوئی ادنیٰ' کوئی اعلیٰ تو نہیں ہو جاتا۔

پھر مجھے اس گھر میں جو اعلیٰ مقام حاصل ہے وہ کسی رئیس زادے کو ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ میں روز صبح اٹھتا ہوں' کار میں بیٹھ کر ایک کھلے میدان میں جاتا ہوں' وہاں دوڑ لگاتا ہوں۔ واپس کار میں آتا ہوں۔ میرے لئے ایک گلاس اوولٹین تیار رہتا ہے' میں اسے پیتا ہوں پھر غسل کرنے جاتا ہوں میری بڑی سی الماری میں قیمتی سوٹ اور طرح طرح کے بہترین لباس ہیں۔ ضرورت کے اور بھی دوسرے قیمتی سامان جو میرے بہنوئی کے پاس ہیں.......... وہ میرے پاس ہیں۔ ایئرکنڈیشنڈ کار میرے بہنوئی کی ہے لیکن چابی میرے پاس رہتی ہے۔ بیٹھتے وہ ہیں' چلاتا میں ہوں۔ انہیں دفتر میں چھوڑنے کے بعد کار دن بھر میرے پاس رہتی ہے اور میں صبح سے شام تک' کبھی کبھی

رات گئے تک شہزادوں کی طرح پیٹرول پھونکتا رہتا ہوں۔

جب کار ہو اور جیب میں بڑے بڑے نوٹ ہوں تو لڑکیاں لفٹ دیتی ہیں۔ کتنی ہی لڑکیاں میری گرل فرینڈ ہیں۔ میں ان سے دوستی کرتا ہوں مگر شادی کا خیال دل میں نہیں لاتا۔ جانے وہ شکیلہ کیسے پسند آ گئی تھی۔ اچھا ہوا اس نے خود میری آفر ٹھکرا دی' اگر مان لیتی تو زندگی بھر کے لئے گلے پڑ جاتی۔

میں نے اکثر سوچا' دنیا والوں کی زبان بند رکھنے کے لئے کچھ اپنا چھوٹا سا کاروبار کرنا چاہئے۔ میں اس مقصد کے لئے باجی جان سے لاکھ دو لاکھ روپے مانگتا تو میرے بہنوئی کنور آفتاب احمد فوراً بینک چیک پر دستخط کر کے دے سکتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ رقم مل سکتی تھی لیکن میں دو چار لاکھ یا دس لاکھ کسی کاروبار میں لگا کر کتنا کما لیتا؟ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اتنا کمانے کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا جتنا میرے بہنوئی کماتے ہیں۔

ہو سکتا ہے مجھے ماہانہ پچیس تیس ہزار یا پچاس ہزار کی آمدنی ہوتی۔ میرے بہنوئی تو ہر دوسرے تیسرے روز لاکھوں روپے بریف کیس میں لاتے تھے پھر وہ اور میری باجی جان ان نوٹوں کو کہاں لے جاتے تھے' کہاں چھپاتے تھے مجھے کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ ویسے یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں تھی کہ کنور آفتاب احمد بہت بڑے اسمگلر ہیں اور میری باجی ان کی دستِ راست ہیں' ان کے اہم معاملات میں بہت اہم رول ادا کرتی ہیں۔

میں بھی ان کی طرح بے انتہا دولت مند بننا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں' ایسے غلط دھندے نہیں کرنا چاہتا۔ مانا کہ میں ایک اسمگلر کے گھر میں رہتا ہوں' وہاں کھاتا پیتا اور عیش کرتا ہوں لیکن وہ صرف ایک اسمگلر کا نہیں' میری بہن اور بہنوئی کا بھی گھر ہے۔ اسمگلنگ ان کا پیشہ ہے اور رشتے داری نبھانا میرا فرض ہے۔

اور میرا فرض یہ بھی ہے کہ میں وہاں رہ کر ان کے گناہوں کو کم کروں۔ ان کی طرف سے ایسی نیکیاں کرتا رہوں جس کے نتیجے میں اعمال نامہ لکھنے والے فرشتے ان کے کھاتے میں کچھ اچھی باتیں بھی لکھتے جائیں۔ اس مقصد کے لئے میں ان کی رقم میں ہیرا پھیری کرتا ہوں۔ ہزاروں لاکھوں کی رقم میں سے ہر دوسرے تیسرے روز پانچ

ہزار دس ہزار غائب کر دوں تو انہیں پتا نہیں چلتا۔ میں بری نیت سے ایسا نہیں کرتا' مجھے اللہ کا خوف ہے۔ میں جو رقم بھی حاصل کرتا ہوں' اس کے چار حصے کرنے کے بعد ایک حصہ غریبوں میں خرچ کر دیتا ہوں۔ کسی یتیم لڑکی کی شادی کے لئے دے دیتا ہوں یا کسی فلاحی ادارے کو چندے کی صورت میں پیش کر دیتا ہوں۔ جو سمجھ دار ہوتے ہیں' وہ ایسی ہی میانہ روی اختیار کرتے ہیں۔ دنیا کو بھی ہاتھ میں رکھتے ہیں اور دین کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

بے چارے نانا جان' اچھا ہوا وفات پا چکے ہیں لیکن انہوں نے میرے پیچھے ہادی کو لگا کر بہت اچھا کیا۔ ہادی کی موجودگی سے میرا ایمان سلامت رہتا ہے۔ وہ اکثر اپنی ہدایات سے مجھے قائل کرلیتا ہے اور کبھی میں اپنے حالات اور مصلحت اندیشی سے اسے خاموش کر دیتا ہوں۔ میں نے اچھا خاصا بینک بیلنس بنالیا ہے ہادی کہتا ہے۔ "یہ بے ایمانی ہے۔ تو اعتماد کرنے والے بہن بہنوئی کو دھوکا دے رہا ہے۔"

میں کہتا ہوں کہ یہ بے ایمانی نہیں ہے۔ میں اپنی ایمانداری اور محنت کا صلہ لیتا ہوں۔ میں ان کی دولت کی حفاظت کرتا ہوں۔ جب میرا بہنوئی لاکھوں روپے بریف کیس میں رکھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے تو میں اس کا محافظ بن کر ساتھ رہتا ہوں۔ ایک بار میں نے بدمعاشوں سے لاکھوں روپے بھی بچائے اور بہنوئی کی جان بھی بچائی۔ تب سے میرے بہنوئی کنور آفتاب احمد مجھ پر اندھا اعتماد کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "یہ سب کچھ تمہارا ہے۔" جب وہ کہہ چکے ہیں کہ سب کچھ میرا ہے تو میں اس میں سے کچھ لے لوں تو کیا یہ چوری اور بے ایمانی ہوگی؟

ہادی کہتا ہے۔ "اگر کوئی تیری وفاداری سے خوش ہو کر یہ کہہ دے کہ یہ سب کچھ تیرا ہے تو وہ تیرا نہیں ہوگا جب تک وہ خود اپنے ہاتھوں سے نہیں دے گا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے نہیں دیتا ہے' تو ان کی لاعلمی میں اپنی ضرورت سے زیادہ رقم لے جاتا ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "کوئی کسی کی ضرورت کا حساب کرسکتا ہے؟ رقم جتنی آتی جاتی ہے' ضرورت بڑھتی جاتی ہے۔" میری باجی جان اور بہنوئی کنور آفتاب احمد کا الگ الگ بینک اکاؤنٹ ہے اور پتا نہیں کتنے ملکوں میں ہے پھر بھی ان کی ضرورت

پوری نہیں ہوتی۔ جو شخص چار روپے کما رہا ہے' وہ چار ہزار کمانے کی فکر میں ہے۔ جو چار ہزار روپے کما رہا ہے وہ چار لاکھ حاصل کرنے کے لئے پریشان ہے۔ ہماری ضرورتیں اتنی بے لگام ہوتی جارہی ہیں کہ ہم انہیں لگام دے کر نہیں روک سکتے۔ اب یہی دیکھیں کہ میں نے پہلے کبھی بیوی اور بچوں کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ سوسائٹی میں میری بڑی عزت ہے۔ تمام لوگ مجھے کنور آفتاب احمد کا سالا سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ میں خوبرو اور اسمارٹ ہوں۔ بڑے بڑے گھرانوں کی لڑکیاں مجھ پر جان دیتی ہیں لیکن بڑے گھرانوں کے بزرگ آخر کار یہی پوچھتے ہیں کہ میں کیا کرتا ہوں۔

باجی جان کا خیال تھا' کسی غریب گھرانے سے تعلیم یافتہ لڑکی بیاہ کر لائیں گی تاکہ وہ گھر کی تمام ذمے داریاں سنبھال سکے کیونکہ میں گھر اور باہر دونوں جگہ ذمے داریاں سنبھالتا تھا۔ کچن میں کھانے کے سامان سے لے کر گھر میں ہر کمرے کا قیمتی آرائشی سامان خود خرید کر لاتا ہوں۔ کبھی کبھی وہ سامان باجی جان اور بہنوئی پسند نہیں کرتے تھے لیکن خریداری کے لئے میں ہی جایا کرتا تھا۔ میرے پاس ہمیشہ بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں رہتی تھیں' جن میں سے ایک آدھ گڈی میرے بینک اکاؤنٹ میں چلی جاتی تھی میری اندھی کمائی تھی اور آئندہ بھی یہ جاری رہنے والی تھی۔ میں نے سوچا' اب شادی کرلینا چاہئے تاکہ کوئی محبت کرنے والی اور میرا انتظار کرنے والی بیوی موجود ہو اور میرے نام سے میرے بچے پرورش پائیں اور ان کے ساتھ میرا نام چلتا رہے۔

میں کوئی لباس سلواتا ہوں تو پہلے باجی جان سے کپڑا پسند کرواتا ہوں۔ میں ان کی مرضی اور مشورے کے بغیر ایک قدم نہیں چلتا۔ ایک بار میں نے ان کی مرضی سے مونچھیں رکھیں۔ دوسری بار ان کی مرضی سے منڈوا دیں' اگر وہ سر منڈوانے کے لئے کہیں گی تو وہ بھی کروں گا۔ میں باجی جان کے لئے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔ وہ مجھے حاصل ہونے والے خزانے کی چابی ہیں۔

میں نے شادی ابھی تک اس لئے نہیں کی کہ انہیں کوئی لڑکی پسند نہیں آئی پھر کچھ عرصے کے لئے معاملہ نہایت سنگین ہوگیا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے دونوں میں طلاق ہو جائے گی۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اگر باجی جان میرے بہنوئی سے الگ ہو جائیں گی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری اندھی آمدنی بھی ختم ہو جائے گی۔ ان دنوں میری حالت ایسی ہی تھی جیسے دبئی، بحرین یا مشرق وسطیٰ کے دوسرے ملکوں میں جاکر کام کرنے والوں کی اس وقت ہوتی ہے جب ان کی ملازمت چھوٹ جاتی ہے اور وہ سوچتے ہیں، وطن واپس جاکر کیا کریں گے۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا، بہن کے سسرال سے میکے واپس جاکر کیا کروں گا۔

اچھا ہوا میری شادی ابھی تک نہیں ہوئی۔ بیوی آتی، بچے ہوتے تو ان کا بوجھ اٹھانا مشکل ہو جاتا۔ اگرچہ میرے اکاؤنٹ میں کوئی چھ سات لاکھ روپے ضرور تھے لیکن اتنی رقم سے کیا ہوتا ہے۔ بہنوئی کے گھر سے نکلنے کے بعد کوئی پانچ چھ لاکھ کی گاڑی خریدنا ضروری تھا کیونکہ میں مہنگی گاڑیوں میں بیٹھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ پیدل چلنے والے مجھے کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگتے ہوئے لگتے تھے اور میں ابھی کیڑا مکوڑا نہیں بننا چاہتا تھا۔

میری باجی اور بہنوئی کے درمیان وہ سنگین معاملہ یہ تھا کہ شادی کو سات برس ہو چکے تھے اور کوئی اولاد نہیں ہو رہی تھی اب بہنوئی صاحب اولاد کے لئے دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔ باجی جان ڈنکے کی چوٹ پر کہتی تھیں۔ "میں بہت بری عورت ہوں۔ اگر ایسی ہی جوانی آئی ہے تو روز عیاشی کیا کرو لیکن شادی نہیں کر سکو گے۔"

میرے بہنوئی نے کہا۔ "مرد کو کبھی چیلنج نہ کرو۔ وہ اپنی ضد پر آجائے تو ہر حال میں وہی کرتا ہے جو سوچ لیتا ہے۔"

"کچھ سوچنے اور کرنے سے پہلے یہ اچھی طرح سمجھ لینا کہ میں تمہارے کالے دھندے میں شریک ہوں۔ ایک ایک راز سے واقف ہوں۔ تمہاری ایسی کی تیسی کردوں گی۔"

ایسے وقت بھائی صاحب نرم پڑ جاتے تھے۔ پیار سے سمجھاتے تھے۔ "ذرا سوچو ہمارے پاس بے انتہا دولت ہے، اس کا کوئی وارث ہونا چاہئے۔ ہمیں کوئی ممی ڈیڈی کہنے والا، ہم سے محبت کرنے والا آئندہ ہمارا نام چلانے والا کم از کم ایک بچہ ضرور ہونا چاہئے۔"

"جب نہیں ہوتا تو میں کہاں سے لاؤں اور یہ تم مردوں کی کیا عادت ہے، خواہ مخواہ عورت کو الزام دیتے ہو تمہیں کیا معلوم کہ میں بانجھ ہوں یا نہیں۔ کیا تم نے اپنا طبی معائنہ کرایا ہے؟"

انہوں نے کبھی معائنہ نہیں کرایا تھا۔ باجی ان کے پیچھے پڑ گئیں۔ وہ کہنے لگے۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ ضد کرنے لگیں۔ "ضرورت ہے، میں یہ پھانس نکال دینا چاہتی ہوں کہ بچے پیدا نہ کرنے کے سلسلے میں کون قصوروار ہے۔"

وہ جس بات کے لئے اڑ جاتی ہیں اسے منوا کر رہتی ہیں بہنوئی صاحب کو ہتھیار ڈالنے پڑے، وہ طبی معائنے کے لئے راضی ہو گئے۔ فیملی ڈاکٹر نے انہیں اسپتال بلایا۔ ان کا معائنہ کیا پھر دوسرے دن رپورٹ پیش کرنے کا وعدہ کر کے میاں بیوی کو رخصت کر دیا۔

میں کار چلایا کرتا تھا۔ وہ دونوں پیچھے بیٹھتے تھے۔ اپنی باتوں میں اس طرح مگن ہو جایا کرتے تھے کہ بہت سی اہم باتیں میری موجودگی میں کر گزرتے تھے۔ شاید بھول جاتے تھے کہ کوئی تیسرا بھی ان کے قریب موجود ہے یا مجھے اس قدر اپنا سمجھتے تھے اور مجھ پر اتنا اعتماد کرتے تھے کہ اپنا کوئی راز مجھ سے نہیں چھپاتے تھے۔ میں نے بہنوئی صاحب کو دفتر پہنچایا پھر باجی جان سے پوچھا۔ "آپ کہاں جائیں گی؟"

وہ میرے ساتھ والی سیٹ پر آکر بیٹھ گئیں پھر کہا۔ "گاڑی چلاؤ۔"

ہم بینک آگئے، وہ اندر گئیں۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئیں تو ان کے ہاتھوں میں کاغذ کا ایک پھولا ہوا لفافہ تھا۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ گاڑی آگے بڑھانے کو کہا پھر بولیں۔ "مجھے بیگم درانی کے ہاں چھوڑ دو اور یہ لفافہ ڈاکٹر صفدر کو دے دو۔ ان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں انہیں بیگم درانی کی کوٹھی کے احاطے میں لے آیا۔ انہوں نے کار سے اترتے ہوئے تاکید کی۔ "خبردار اپنے بہنوئی سے کبھی یہ نہ کہنا کہ تم نے کوئی لفافہ ڈاکٹر صفدر کو پہنچایا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی بات ہی نہ کرنا۔"

وہ کوٹھی کے اندر چلی گئیں۔ میں نے کار اسٹارٹ کی پھر ڈاکٹر صاحب کی طرف

چل پڑا۔ راستے میں ایک جگہ گاڑی روک کر اس لفافے کو کھول کر دیکھا۔ اس میں پانچ پانچ ہزار کی پانچ گڈیاں تھیں یعنی پچیس ہزار روپے تھے۔ یہ رقم میں نے ڈاکٹر صفدر کے حوالے کی انہوں نے خاموشی سے لے لی۔ میں خاموشی سے واپس آگیا۔

دوسرے دن میرے بہنوئی کنور آفتاب احمد کی میڈیکل رپورٹ میں یہ صاف طور پر لکھا ہوا تھا کہ ان میں خرابی ہے اور وہ کبھی باپ نہیں بن سکیں گے۔

باجی جان نے وہ رپورٹ تہہ کرکے اپنے پرس میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا اب بھی دوسری شادی کا ارادہ ہے؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔ "تم یقین کرو' مجھے دوسری شادی کا شوق نہیں ہے میں صرف اولاد چاہتا تھا اور یہ مجھے کبھی نہیں مل سکے گی۔"

"کیوں نہیں ملے گی۔ کیا ہم کسی کا بچہ گود نہیں لے سکتے؟"

"دوسرے کی اولاد آخر دوسرے ہی کی ہوتی ہے' اپنی نہیں ہوتی ہے۔"

وہ بولیں۔ "اگر ہم کسی دور دراز کے علاقے میں جائیں۔ وہاں کسی غریب عورت کا بچہ گود لے لیں اور یہاں آکر اعلان کردیں کہ اس بچے کو میں نے جنم دیا ہے اور تم اس کے باپ ہو تو؟"

وہ سرہلا کر بولے۔ "ہاں' اچھا آئیڈیا ہے لیکن اچھا خون اور اچھی نسل کا بچہ ہونا چاہئے اور اس بات کا بھی یقین ہونا چاہئے کہ بچہ ہمارے حوالے کرنے والی عورت یا اس کے رشتے دار پھر کبھی ہماری زندگی میں نہ آئیں اور نہ ہی اس بچے کا مطالبہ کریں۔"

باجی جان نے کہا۔ "ہم جس سے بچہ لیں گے ان لوگوں کو ہماری موت کے بعد بھی یہاں نہیں آنا چاہئے' ورنہ وہ بچے کے ذریعے ہماری تمام دولت اور جائیداد پر قبضہ جمالیں گے۔"

"بے شک اس طرح میرے نام سے کوئی نسل بھی نہیں چلے گی اور ہماری تمام عمر کی کمائی بھی چلی جائے گی۔"

وہ اس موضوع پر دو دنوں تک بحث کرتے رہے ہر پہلو سے غور کرتے رہے۔ تیسرے دن اچانک ہی باجی جان نے مجھے دیکھا تھوڑی دیر تک اسی طرح سوچتی ہوئی

نظروں سے دیکھتی رہیں۔ پھر بولیں۔ "تم میرے لئے کیا قربانی دے سکتے ہو؟"

"میری جان مانگئے' ابھی دے دوں گا۔"

"اپنی جان دینا زیادہ مشکل نہیں ہے کیا اپنی اولاد دے سکتے ہو؟"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں اپنے جسم کا تمام خون نچوڑ کر دینے کو تیار ہوں' ایک اولاد کیا چیز ہے۔"

میرے بہنوئی نے کہا۔ "یعنی تم یہ سوچ رہی ہو کہ بھائی کی شادی کروگی' اس سے اولاد ہوگی تو اسے ہم گود لیں گے؟"

"میں یہی سوچ رہی ہوں۔"

"لیکن دنیا والوں کو تو یہی معلوم ہوگا کہ وہ ہادی کی اولاد ہے۔"

"دنیا والوں کو نہیں معلوم ہوگا' یہ بات راز میں رہے گی۔"

"کیسے راز میں رہے گی۔ ہادی ہمارا اپنا ہے' ہمارا وفادار ہے۔ اس نے کبھی ہمارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ ہم جو کہیں گے وہ کیا کرے گا لیکن اس کی بیوی ہماری اپنی نہیں ہوگی۔ ہم کس حد تک اس پر بھروسا کرسکیں گے۔"

باجی جان نے کہا۔ "یہ باتیں مجھ پر چھوڑ دو' میں ایسی لڑکی تلاش کروں گی جو ہمارے سامنے دم نہیں مارے گی۔"

میرے بہنوئی نے کہا۔ "اچھی طرح سوچ لو' لڑکیاں شادی سے پہلے بھولی بھالی اور گونگی بہری نظر آتی ہیں لیکن شادی کے بعد سسرال والوں کے بس میں نہیں رہتیں۔"

باجی جان نے خاموش طنزیہ نظروں سے میرے بہنوئی کو دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ان کی نظروں کو میں سمجھ رہا تھا۔ وہ یقیناً دل میں کہہ رہی ہوں گی' جب میں تمہارے جیسے چالاک اور بدترین اسمگلر کو اُلو بنا سکتی ہوں تو ایک لڑکی کیا چیز ہے؟

اس دن سے ایک ایسی لڑکی کی تلاش شروع ہوگئی جو میری باجی جان اور بہنوئی کے لئے ماں بنے پھر بچہ ان کے حوالے کرکے ممتا سے محروم ہوجائے۔ یہ بات ممکن نہیں ہے' ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ اگر ایک ماں چار وقت فاقے کرکے ایک وقت کھاتی ہے اور پھر چار وقت فاقے کرکے ایک وقت کھاتی ہے۔ طرح طرح کے مسائل کا سامنا

کرتی ہے ' بیماریوں کو جھیلتی ہے۔ جو انتہائی بدنصیب ہوتی ہے ' وہ بھی اپنا نصیب بنانے کے لئے بچے کا سودا نہیں کرتی۔ اپنے جسم کا ایک حصہ نوچ کر کسی دوسرے کو کبھی نہیں دیتی۔

باجی جان نے کہا۔ "آفتاب! انسان ضد میں آکر وہ کام ضرور کرتا ہے جو ناممکن دکھائی دیتا ہے۔ تمہارے راستے میں کتنی قانونی پابندیاں اور کیسی کیسی سختیاں ہوتی ہیں ' اس کے باوجود تم اِدھر کا مال اُدھر سرحد پار لے جاتے ہو اور سرحد پار کا مال اِدھر لے آتے ہو۔ میں بھی اُدھر کا مال اِدھر لے آؤں گی اور وہ مال اپنا کہلائے گا۔"

باجی جان اور میرے بہنوئی ایک بچے کے معاملے میں اس لڑکی کو زیادہ اہمیت دے رہے تھے جو میری بیوی بننے والی تھی اور میرے بچے کی ماں ' جب کہ میں بچے کا باپ بننے والا تھا ' میری کوئی اہمیت نہیں تھی۔ مجھ سے باجی جان نے صرف ایک بار پوچھا۔ "کیا اپنی اولاد دو گے؟" میں نے ہامی بھرلی۔ اس کے بعد انہیں اطمینان ہوگیا۔ وہ جانتی تھیں میرے منہ میں ان کی زبان ہے۔ وہ ہاں بولتی ہیں تو میں ہاں بولتا ہوں ' نہ کہتی ہیں تو نہ کہتا ہوں۔ میں اپنے دماغ سے کبھی نہیں سوچتا۔ جو بات وہ میرے دماغ میں ٹھونس دیتی ہیں میں اسی کو مان لیتا ہوں۔ انہوں نے میری اماں جان اور ابا جان کو لڑکی کی تلاش پر مامور کیا۔ انہیں اس سلسلے میں چند اہم باتیں سمجھادیں۔ پہلی بات تو یہ کہ ہم لاہور میں رہتے ہیں۔ لڑکی کم از کم دریا پار یعنی راوی یا جہلم کے اس پار کسی شہر یا پنڈ کی ہونی چاہئے۔

دوسری بات یہ کہ لڑکی اور اس کے گھر والوں کو کبھی یہ معلوم نہ ہو کہ ہمارا باجی جان اور کنور آفتاب احمد سے کوئی رشتہ ہے۔ یہ رشتہ کسی نازک مرحلے پر بھی ظاہر نہ کیا جائے۔ اگر کبھی فراڈ کھل جائے ' تھانے کچہری کا معاملہ آجائے تب بھی ہم باجی اور بہنوئی صاحب کے دروازے پر نہ آئیں۔ وہ دونوں پس پردہ رہ کر ہمیں بھاری سے بھاری ضمانت دے کر رہا کرائیں گے ' ہمارا مقدمہ لڑیں گے ' ہمیں جیل جانے سے بچائیں گے۔

یہ تو قانونی کارروائیوں والی بات تھی ' ورنہ میرے بہنوئی چاندی کے جوتے مار کر معاملے کو ایف آئی آر تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم کرادیتے ہیں۔ میری اماں جان اور

ابا جان کو تیسری بات یہ سمجھائی گئی کہ جیسا کہ میں خوبرو ہوں ' ویسی ہی لڑکی بھی حسین ہونی چاہئے تاکہ اولاد خوبصورت پیدا ہو۔

آخر میں باجی جان نے مجھ سے کہا۔ "دیکھو ہادی! تم آج ہمارے وفادار ہو۔ اگر شادی کے بعد بھی اسی طرح ہمارے وفادار رہو گے تو اپنی آخری سانس تک عیش و عشرت کی زندگی گزارتے رہو گے۔ یہ تو دیکھ ہی رہے ہو کہ میرا شوہر کماتا ہے اور دولت تمہارے ہاتھوں میں آتی ہے ' تمہی بینک میں جمع کراتے ہو ' تمہی خرچ کرتے ہو۔ ہم کبھی تم سے حساب نہیں لیتے۔ یہ نہ سمجھو کہ بہن نادان ہے میں جانتی ہوں ' تمہارا ایک الگ بینک اکاؤنٹ ہے۔ اچھی بات ہے ' ہونا چاہئے۔ میرے بھائی ہو ' برا وقت کبھی پوچھ کر نہیں آتا۔ اگر ہم پر کوئی وقت آپڑا ' اگر رشوت لینے والے افسروں کا تبادلہ ہوجائے گا ' کوئی سخت قسم کا اعلیٰ افسر آجائے گا اور ہمیں قانونی گرفت میں لے گا تو ہمارے بعد تم کسی کے محتاج نہیں رہو گے۔"

میں نے باجی جان کے پاؤں پکڑ لئے ' قسمیں کھائیں کہ آخری سانس تک ان کا وفادار رہوں گا۔ انہوں نے کہا۔ "تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں لیکن یہی دیکھا گیا ہے کہ لڑکی میکا چھوڑ کر آتی ہے تو اپنے مرد کو سسرال سے بھی چھڑا دیتی ہے۔ اس کے حسن اور اداؤں کا جادو ایسے چلتا ہے کہ مرد اپنی پیدائش سے لے کر اب تک کے تمام معزز رشتوں کو ٹھکرا دیتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "میں آپ کے اطمینان کے لئے کیا کرسکتا ہوں؟"

"میں جو کہوں گی ' اس پر عمل کرتے رہو ' مجھے اطمینان ہوگا۔ مثلاً تم بیوی سے زیادہ محبت نہیں کرو گے۔ جب اولاد ہوگی تو اسے چھوڑ دو گے۔"

میں نے پریشان ہو کر باجی کو دیکھا کیونکہ دل میں خوفِ خدا ہے۔ کسی لڑکی کے ساتھ ایسا ظلم کرنا سراسر انسانیت کے خلاف ہے۔ وہ بولیں۔ "کوئی لڑکی اولاد ہونے کے بعد تمہاری بیوی بن کر رہے گی تو اپنے بچے کا مطالبہ کرتی رہے گی۔ وہ دنیا والوں سے کہتی پھرے گی کہ اس کا بچہ ہمارے پاس ہے۔"

"باجی جان! میں اسے چھوڑ دوں گا تب بھی وہ دنیا والوں سے یہی کہتی پھرے گی۔"

"تب نہیں کہہ سکے گی۔ میں ایسی تدبیر کروں گی کہ اس کی زبان بچے کے سلسلے میں کچھ نہیں بولے گی۔"

میں اپنی بہن کی چالاکی اور سازشی ذہن کو مانتا ہوں وہ اپنی سوکن کا راستہ روکنے کے لئے اپنے شوہر کو ایک بچے سے بہلانے کے لئے طرح طرح کی چالیں چل رہی تھیں۔ وہ ضد میں آکر جب بھی کوئی چال چلتی ہیں تو ضرور کامیاب ہوتی ہیں۔ میں نے کہا۔ "آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ آپ کہتی ہیں تو میں ایک بچے کے بعد اسے چھوڑ دوں گا لیکن باجی کیا یہ ناانصافی نہیں ہوگی؟ آپ تو بڑی خدا ترس ہیں۔ دل میں خوفِ خدا بھی ہے پھر کیا یہ مناسب ہوگا؟"

"میں بے شک خدا سے ڈرتی ہوں۔ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتی جس کے نتیجے میں مجھ پر عذاب نازل ہو۔ جو لڑکی میرے بھائی کی زندگی میں آئے گی اور مجھے ایک بچہ دے گی' میں اسے خالی ہاتھ نہیں جانے دوں گی۔ اسے اتنا کچھ دوں گی کہ تمام عمر کسی کی محتاج نہیں رہے گی۔ بلکہ دوسرے محتاج اس کے پاس ہاتھ پھیلانے آیا کریں گے۔"

باجی نے مجھے سمجھا دیا۔ میں نے سمجھ لیا لیکن ہادی میرے پیچھے پڑ گیا۔ "بھلا یہ بھی کوئی منطق ہے! نکاح کے نام پر ایک لڑکی کی عزت اور معصومیت سے کھیلا جائے۔ اس سے اولاد پیدا کی جائے' وہ اولاد بہن کے حوالے کر کے اس بے چاری کو ٹھکرا دیا جائے۔"

میں نے کہا۔ "دیکھ ہادی! غلط لفظ استعمال کرو گے تو بات غلط سمجھ میں آئے گی۔ تم ٹھکرانے کا لفظ کیوں استعمال کرتے ہو ہم اسے ٹھوکر نہیں ماریں گے۔ اس کی پیدا کرنے والی ماں اور اس کی پرورش کرنے والا باپ اس کے جتنے کام نہیں آئے گا' اس سے زیادہ ہم کام آئیں گے۔ اسے اس سوسائٹی میں ایسی سطح پر لا کر کھڑا کر دیں گے جہاں اس کے لئے ایک نہیں' دو نہیں' سینکڑوں رشتے آئیں گے۔ وہ پھر شادی کر کے گھر بسا لے گی۔ اس کا ایک چاہنے والا شوہر ہوگا پھر اس سے اولادیں پیدا ہوں گی اور وہ تمام اولاد اس کی ہوگی پھر کوئی اس کی اولاد کا سودا نہیں کر سکے گا کیونکہ اس وقت وہ مجبور نہیں ہوگی۔"

ہادی نے کہا۔ "اے غلام حسین! کیوں ناجائز بات کو موڑ توڑ کر جائز بنا رہا ہے۔ ایک عورت کا خون نچوڑ کر پھر اسے زندگی دینے کی بات کرتا ہے۔"

"ہماری اقتصادی زندگی میں ہر شخص ایک دوسرے کا خون نچوڑتا ہے۔ کیا سرمایہ دار مزدور سے محنت نہیں لیتا' کیا اس پر جبر کرتا ہے کہ وہ محنت کرے اور اپنا خون پسینہ بہائے؟ نہیں مزدور اپنی ضرورت کے تحت آتا ہے' اپنی محنت بیچتا ہے' اس کے صلے میں اسے رقم ملتی ہے۔ میری زندگی میں جو لڑکی میری بیوی بن کر آئے گی وہ اپنا خون پسینہ بہانے کے بعد یہاں سے دولت مند ہو کر جائے گی۔ اس کے سارے دلدر دور ہو جائیں گے' وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنی زندگی سنوارے گی۔"

ہادی نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اوہ خدایا! آج کا انسان اپنے عمل کو جائز ثابت کرنے کے لئے کیسے کیسے دلائل پیش کرتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ارے اللہ کو کیا آواز دیتے ہو' کیا اللہ صرف تمہارا ہے' ہمارا نہیں ہے کیا۔ اللہ سے تم ڈرتے ہو' ہم نہیں ڈرتے۔ کیا وہ صرف تم پر مہربان ہے' ہم پر مہربان نہیں ہے۔ اگر تم مانتے ہو کہ وہ ہم پر مہربان ہے' ہمیں عیش و عشرت میں رکھتا ہے' ہم جتنا کماتے ہیں' اس سے زیادہ دیتا ہے تو پھر سمجھ لو کہ ہم کسی کا برا نہیں چاہتے ہیں۔ اگر کسی کو ہماری ذات سے ذرا تکلیف پہنچتی ہے تو ہم فوراً اس کی تلافی کرتے ہیں۔ اس کی تکلیف دور کرنے کے لئے اسپتال کھول دیتے ہیں۔ اسے پانچ روپے کی ضرورت ہوتی ہے' ہم پچاس ہزار دیتے ہیں' اس سے زیادہ نیکی کیا ہو سکتی ہے۔ سچ بات تو یہ ہے' تم نیکی کو سمجھتے ہی نہیں ہو اللہ سمجھتا ہے اور اس کا صلہ ہمیں دے رہا ہے اور ہم خوشحال ہیں۔"

یہ ہادی جب تک میرے اندر بیٹھا رہے گا' پریشان کرتا رہے گا۔ میں اپنی آپ بیتی کی طرف آتا ہوں۔ جب میری امی جان اور ابا جان' لڑکی کی تلاش میں نکلے تو درجنوں لڑکیاں دیکھ لیں۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ باجی جان کو ان لڑکیوں کی تفصیلات بتائی جاتی تھیں اور وہ ان میں کوئی نہ کوئی خامی نکال دیتی تھیں۔ وہ میرا بچہ گود لینے کے سلسلے میں ایسی کوئی کمزوری چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں' جس کے نتیجے میں کبھی پچھتانا پڑے۔ بہرحال ہماری تلاش آخر کار ممتاز پر آکر ختم ہوگئی۔

باجی جان کو رپورٹ سنائی گئی۔ لڑکی بے حد خوبصورت ہے' اٹھارہ برس کی عمر میں دس جماعتیں پاس کر چکی ہے۔ بچپن سے آنکھیں کچھ خراب تھیں۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ آگے پڑھنا چاہتی تھی اچانک آنکھوں کی روشنی بجھ گئی اور اندھی ہوگئی۔

یہ سنتے ہی باجی جان خوشی سے کھل گئیں۔ انہوں نے میرے بہنوئی کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے ہمارے کام کی لڑکی۔"

اماں جان نے کہا۔ "لڑکی کی عمر اب بائیس برس ہے۔ چار برس سے اندھی ہے۔ کسی بڑے شہر میں آئی بینک وغیرہ سے رابطہ قائم نہیں کر سکتی۔ اس کا باپ اَن پڑھ ہے۔ ایک چھوٹا سا زمیندار ہے۔ اس کے پاس جو بھی جمع پونجی ہے' وہ بیٹی کی آنکھیں روشن کرنے کے لئے خرچ کرنا چاہتا ہے لیکن وہ ایسے ذرائع نہیں جانتا جو اسے کسی آئی بینک یا آئی اسپیشلسٹ تک پہنچا دیں۔"

میرے بہنوئی نے کہا۔ "کیا اور کوئی رشتے دار نہیں ہے؟"

"کوئی نہیں ہے' نہ ماں' نہ بھائی' نہ بہن' دور پرے کے رشتے دار دور دراز کے پنڈ میں رہتے ہیں لیکن ان کے پاس نہیں آتے کیونکہ لڑکی دس جماعت پاس کرنے کے بعد اب کسی اَن پڑھ چچا زاد' ماموں زاد' پھوپی زاد یا تایا زاد سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

باجی جان نے کہا۔ "یہ تو اور اچھی بات ہے۔ لڑکی کا صرف باپ ہے اور کوئی سگا رشتے دار نہیں ہے' دور کے رشتے دار ملنے نہیں آتے۔ اس کے بارے میں اور کچھ بتاؤ۔"

"وہ عارف والا سے تین میل کے فاصلے پر بسم اللہ بستی میں رہتے ہیں۔ اس بستی میں گنتی کے چند مکانات ہیں۔ عورتیں' بچے' بوڑھے اور نوجوان ملا کر مشکل سے ستر اسّی افراد ہوں گے۔ سب اپنے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ شہری زندگی کے متعلق بہت کم جانتے ہیں۔ اگر ہم لڑکی کو وہاں سے بیاہ کر لائیں گے تو اس کے برے بھلے میں کوئی کچھ پوچھنے نہیں آئے گا۔ اگر کوئی آئے گا تو ایسے جاہل گنوار کسانوں سے نمٹا جا سکتا ہے۔"

میرے بہنوئی نے میری امی جان اور ابا جان سے کہا۔ "اب آپ دونوں عارف والا چلے جائیں' وہاں ایک اچھا سا مکان خرید کر رہائش اختیار کرلیں۔ کوئی بھی پوچھے تو کہہ دیں' سندھ کے کسی چھوٹے سے علاقے میں رہتے تھے۔ آپ کا بیٹا غلام حسین دوبئی میں ملازمت کر رہا ہے۔ اس نے خط لکھا تھا کہ اب ہم پنجاب کے کسی علاقے میں جاکر مکان خرید لیں' اس لئے آپ لوگوں نے عارف والا میں وہ مکان خریدا ہے۔ بیٹا دو ماہ بعد دو مہینے کی چھٹی لے کر آرہا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ اس کے دوبئی واپس جانے سے پہلے شادی کردی جائے لہٰذا اچھی سی لڑکی تلاش کر رہے ہیں۔"

باجی جان نے میرے والدین سے کہا۔ "جب آپ اس لڑکی کے باپ سے بات کریں گے تو وہ ضرور پوچھے گا کہ آپ ایک اندھی لڑکی کیوں پسند کر رہے ہیں۔ اس کا جواب یہی ہونا چاہئے کہ یہ پیدائشی اندھی نہیں ہے' اس کی آنکھوں کا علاج کرانا ہمارا فرض ہے۔ شادی کے بعد ہم اس کی آنکھیں واپس لے آئیں گے۔"

اماں جان نے کہا۔ "بیٹی میرا تو مشورہ ہے' شادی سے پہلے اس کی آنکھیں ٹھیک کرادو۔ کہیں ایسا نہ ہو' وہ اندھی رہے گی تو اولاد بھی اندھی پیدا ہو۔"

باجی جان نے کہا۔ "یہ جاہلانہ باتیں ہیں۔ اندھی کی اولاد اندھی اور گونگے کی اولاد گونگی نہیں ہوتی۔ اولاد پیدا ہونے تک اس کا نابینا رہنا ضروری ہے تاکہ یہ نہ معلوم ہو کہ بچہ زندہ پیدا ہوا تھا یا مُردہ' ہم تو اسے مُردہ ہی بتائیں گے۔"

☆======☆======☆

سہاگ کی سیج پر گلاب کی پتیاں خوشبو لٹا رہی تھیں۔ اس کا پھول جیسا چہرہ میری ہتھیلیوں کے گلدان میں سجا ہوا تھا۔ بے نور آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ میں اس کی آنکھوں پر جھک گیا پھر محبت سے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "ممناز! آج آنسو بھا............ بھا............ بہانے کی رات نہیں ہے' جذبوں میں بہنے کی رات ہے............ کیا تم مجھ سے شادی کر کے پچھتا رہی ہو؟"

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ آنسو اور بہنے لگے میں نے انہیں پونچھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "میں سوچتی تھی' ایک دن خود کو دلہن کے روپ

میں دیکھوں گی۔ جانے کیسی لگوں گی لیکن میں آئینہ نہ دیکھ سکی' کوئی بات نہیں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ میں آپ کو نہیں دیکھ سکتی۔"

"اس میں رونے کی کیابات ہے۔ آئی............ آئی............ آئی بینک میں تمہارا نام لکھا جاچکا ہے۔ تمہارا نمبر آتے ہی آنکھیں مل جائیں گی پھر تم مجھے دن رات دیکھ سکو گی۔"

"کیا آپ اندھے پن کے باوجود مجھے چاہتے ہیں؟"

میں اسے چاہت کا یقین دلانے لگا۔ وہ مجھے دیکھ نہیں سکتی تھی' میری محبت کو سمجھ سکتی تھی۔ میں اسے سمجھ بھی رہا تھا اور دیکھ بھی رہا تھا بلکہ ایسے دیکھ رہا تھا جیسے مونچھوں پر تاؤ دے کر چیلنج کیا جاتا ہے۔ "دیکھ لوں گا۔ میرا نام غلام حسین ہادی ہے' دیکھ لوں گا۔"

یوں دیکھتے رہنے کا انجام میرے حق میں برا ہوا۔ وہ صبح تک میرے دل اور دماغ میں بری طرح نقش ہو گئی۔ باجی جان نے اچھی طرح سمجھادیا تھا' مجھے صرف شوہر رہنا چاہئے دیوانہ عاشق نہیں بننا چاہئے۔ مجھے ان کے نقطہ نظر کے مطابق پریشان ہونا چاہئے تھا کہ ایک رات میں اس کا جادو سرچڑھ کر بول رہا ہے۔ ابھی دو ماہ اس کے ساتھ گزریں گے۔ جانے اس کی چاہت کیا گل کھلائے گی۔ اس وقت میں پریشان نہیں تھا کیونکہ محبت پریشان نہیں کرتی' آسودہ کرتی ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں اس کے سامنے اپنی باجی جان کو بھول گیا تھا۔ جن کے سائے میں رہ کر کچھ محنت کئے بغیر کوئی کاروبار کئے بغیر دولت مند بن گیا تھا میں ان کی عزت بھی کرتا تھا اور ان سے ڈرتا بھی تھا۔ گہری نیند میں بھی ان کی آواز سن لوں تو فوراً اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ جتنی مہربان تھیں اتنی ہی ظالم بھی تھیں۔ میں بعض حالات میں اللہ کا خوف بھول جاتا تھا لیکن خوفناک باجی جان کو بھلا نہیں سکتا تھا۔ مہناز نے میرے دماغ سے بھلا دیا' یہ زیادہ حیرانی کی بات نہیں تھی۔ لوہا لوہے کو اور عورت' عورت کو کاٹتی ہے۔ بیوی نے بہن کے رشتے کو کاٹنا شروع کردیا تھا۔

میں دن کے گیارہ بجے گھر سے نکلا۔ عارف والا میرے لئے نئی جگہ نہیں تھی۔ میں وہاں کے بازار میں گھومنے کے لئے گیا۔ مہناز سے دور ہوتے ہی اچانک باجی جان

یاد آئیں۔ میں نے حیرانی سے سوچا۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کل سے اب تک میں نے بہن کو یاد نہیں کیا۔ پتا نہیں ان کی نصیحتوں پر عمل کرتا رہا ہوں یا نہیں' مجھے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ میں مہناز کے سامنے ہکلا کر بولتا رہا ہوں یا نہیں' مجھ پر تو عجب سحر طاری تھا۔ میں اپنے آپ کو بھول جاتا تھا پھر بھلا دوسری باتیں کیسے یاد رہتیں؟

میں مہناز سے دور ہو کر بازار میں گھوم رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کی ایک ایک ادا دل کو چھو رہی تھی۔ پہلے اور اب میں فرق یہ تھا کہ اب میں اپنے اختیار میں تھا' وہ دیوانگی نہیں تھی کہ میں اپنی بہن کو بھلا دیتا' یہ بھی یاد آرہی تھی' وہ بھی یاد آرہی تھیں۔ میں نے سوچا یہ ہادی کہاں مرگیا' ایسے وقت مجھے ہدایت کیوں نہیں دیتا۔ اسے سمجھانا چاہئے کہ بہن زیادہ معزز ہے اس کا رتبہ بڑا ہے۔ اس نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے' اس سے خون کا رشتہ ہے' دولت کا رشتہ ہے' اونچی سوسائٹی میں شہرت اور نیک نامی کا رشتہ ہے۔ اس کے مقابلے میں مہناز کیا ہے۔ صرف پچھلی رات آئی ہے۔ اپنی خالی بے نور آنکھوں میں صرف محبت لے کر آئی ہے۔ کیا محبت اتنی قوی ہوتی ہے کہ خون کے' دولت کے اور اونچی سوسائٹی میں نیک نامی کے تمام رشتوں کو صرف ایک رات میں ہی کمزور کردیتی ہے۔

میں نے گھر سے نکلتے وقت سوچا تھا' زیادہ دیر باہر رہوں گا' بازار کا ایک چکر لگانے کے بعد آبادی سے دور جاکر کہیں سائے میں بیٹھوں گا اور باجی جان کو یاد کروں گا۔ شیطان آزمائش میں مبتلا کرے تو بندہ اپنے اللہ کو نہ بھولے' اولاد اپنے والدین کو نہ بھولے اور بھائی اپنی بہن کو یاد رکھے۔ اپنی یادداشت کی کتاب کھول کر اپنی بہن کے تمام احکامات کو پھر سے یاد کرے اور اس پر عمل کرے اور میں یہی کرنا چاہتا تھا۔

میں آبادی سے ذرا دور جاکر زیادہ دیر نہ بیٹھ سکا۔ دن کا ایک بجتے ہی بھوک لگنے لگی' اگر شہر میں ہوتا تو مہنگے سے مہنگے ہوٹل میں جاکر کھانا کھاتا۔ عارف والا میں مزدوروں' ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں کے معیار کے مطابق نہایت ہی گھٹیا ہوٹل تھے جہاں میں بیٹھ کر کھانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا لہٰذا گھر آنا پڑا۔ گھر آکر کھانے کے بعد باہر نہ نکل سکا۔ کمرے میں مہناز کے پاس آکر بیٹھا تو اٹھ نہ سکا وہ اندھی محبت کررہی تھی اور میری محبت اندھی ہوتی جارہی تھی۔

جب تک ایک نئی دلہن کی شرم اور جھجک تھی' مہناز کم بولتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ اپنی آنکھوں کے متعلق گفتگو کرتی تھی یہی پوچھتی تھی۔ "کب مجھے آنکھیں ملیں گی' کب میں آپ کو دیکھوں گی اور آپ کی آنکھوں سے یہ دنیا کتنی حسین دکھائی دے گی جو کچھ میں نے اٹھارہ برس کی عمر تک دیکھا' اس سے بھی زیادہ یہ دنیا خوبصورت ہو گی کیونکہ اب میرے ساتھ میرا جیون ساتھی ہے۔"

میرے بہنوئی کنور آفتاب احمد وسیع ذرائع کے مالک ہیں وہ ایک ہفتے یا ایک مہینے کے اندر مہناز کو آنکھوں کی روشنی دلا سکتے تھے لیکن باجی جان کے منصوبے کے مطابق روشنی اسی وقت ملتی جب وہ ایک بچے کی ماں بن جاتی۔

میں' باجی کی پریشانیوں کا خیال کرتا ہوں تو ان سے اور محبت بڑھ جاتی ہے۔ بے چاری ایک سوکن کا راستہ روکنے کے لئے کیسے کیسے جتن کر رہی تھیں۔ پھر اس بات کا بھی خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ کو ناراض نہیں کرنا ہے اپنے وعدے کے مطابق ایک اندھی لڑکی کو آنکھیں دلانا ہیں اور اس کے لئے اتنا کچھ کر دینا ہے کہ وہ شوہر سے بچھڑنے کے بعد محرومیوں اور نامرادیوں کا زیادہ اثر نہ لے۔

وہ تنہائی میں مجھے چھو کر دیکھتی تھی۔ اندازہ کرتی تھی' میں کیسا ہوں میرے دل میں اندیشہ پیدا ہوتا تھا۔ کیا مجھے اس طرح چھو کر میرے چہرے کے ایک ایک نقش کو ٹٹول کر اپنے تصور میں میری صحیح تصویر بنا لے گی؟

پھر میں اس اندیشے پر مسکرا دیتا تھا۔ وہ کوئی منجھی ہوئی مصورہ نہیں تھی کہ مجھے بار بار چھونے کے بعد میری صحیح تصویر بنا سکے۔ میرے دل میں چور تھا' اس لئے ڈرتا تھا۔ توبہ توبہ' آدمی کو اپنے دل کا چور نکال دینا چاہئے۔ جب یہ چور نکل جاتا ہے تب ہی آدمی صرف اللہ سے ڈرتا ہے۔

ایک دن مہناز نے کہا۔ "میں یہ نہیں پوچھوں گی' آپ کی ماہانہ آمدنی کیا ہے صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں' ہم کسی بڑے شہر میں مکان لے کر رہ نہیں سکتے؟ آپ نے اس چھوٹے سے علاقے میں اتنا بڑا مکان کیوں خرید لیا؟"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اگر میں یہ مکان نہ خریدتا تو تم مجھے کک.......... کک.......... کیسے ملتیں؟"

"اب تو مل گئی ہوں' کیا ہم یہ مکان فروخت کر کے شہر میں نہیں رہ سکتے؟ میں جب اپنے پنڈ سے اسکول میں پڑھنے کے لئے عارف والا آتی تھی اور اتنا طویل فاصلہ روز طے کرتی تھی تو سوچتی تھی' مجھے ایسا دولہا ملے جو مجھے یہاں سے اُڑا کر بہت بڑے شہر میں لے جائے۔ وہاں لوگ صحیح معنوں میں جینے کا لطف اٹھاتے ہیں۔ ہر طرح کی آسائشیں ہیں۔ اب میں یہ باتیں صرف اپنے لئے نہیں سوچ رہی ہوں۔ میں مستقبل میں دور تک دیکھ رہی ہوں۔ اپنی اولاد کا مستقبل کسی بڑے شہر میں بنانا چاہتی ہوں پھر اپنے بچوں کو بڑے شہر سے بڑے ملکوں میں لے جانا چاہتی ہوں۔"

وہ بول رہی تھی اور میں اس کے معصوم سے جذباتی چہرے کو دیکھ رہا تھا جس میں عزم تھا' استقلال تھا اور ماں بننے سے پہلے ہی ممتا کا نور جھلک رہا تھا۔ اگر ایسے وقت میرے سامنے آئینہ آتا تو میں کبھی اپنا منہ نہ دیکھتا کیونکہ آئینے میں اپنی جگہ کتا بھونکتا ہوا دکھائی دیتا۔ بھوں.......... بھوں.......... بھوں.......... بہن کے گھر بھائی کتا۔ بھوں.......... بھوں.......... بھوں..........

ابھی بہ مشکل ایک ماہ گزرا ہو گا' مجھے مہناز کی محبت سے ڈر لگنے لگا۔ وہ طرح طرح کی انجانی زنجیروں میں جکڑ رہی تھی۔ میں ان زنجیروں کو توڑ کر باجی جان اور بہنوئی صاحب کی پناہ میں جانا چاہتا تھا لیکن ابھی ایک ماہ اور باقی تھا۔ میں نے مہناز سے کہا تھا' دو ماہ کی چھٹی پر آیا ہوں۔ شادی کی وجہ سے یہ چھٹی بڑھا دی تھی' اب رخصت ہونے میں صرف ایک مہینہ رہ گیا تھا۔

جب وہ یہ سنتی تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ اِدھر میں سوچ رہا تھا' کسی طرح یہ ایک مہینہ اور گزر جائے اور میں یہاں سے بھاگ جاؤں ورنہ یہ عورت اپنی معصومیت سے اور محبت کی سچائیوں سے مجھے مارتی رہے گی۔

لیکن دو ماہ کی مدت مقرر کرنے سے کیا ہوتا ہے' ہم قدرت کا فیصلہ بدل تو نہیں سکتے۔ کوئی ضروری نہیں تھا کہ دو مہینے میں مہناز کے پاؤں بھاری ہو جاتے اور میں رخصت ہو جاتا۔ میرے بہنوئی نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ "میاں صاجزادے! اب تک کنوارے رہے' اب شوہروں کے گر سیکھ لو' حالانکہ میں بھی کوئی دانش مند شوہر نہیں ہوں۔ اگر ذرا بھی عقل ہوتی تو تمہاری باجی جان کو اپنے کالے دھندے کا راز

دار کبھی نہ بناتا۔ بہرحال تم ایسی حماقت نہ کرنا' عورت کو صرف پاؤں کی جوتی سمجھنا۔ جب تک شریکِ حیات کے پاؤں بھاری نہ ہوں' آرام سے وہاں چھٹیاں گزارتے رہنا۔ اس سے یہی کہنا کہ اس کی محبت میں جدا ہونے کو جی نہیں چاہتا' اس لئے چھٹیاں بڑھوا رہے ہو۔ جس دن تمہیں خوشخبری ملے اس دن تم ایک سادہ کاغذ اس کے ہاتھ میں لاکر تھما دینا اور کہنا دوبئی سے خط آیا ہے اب چھٹی نہیں بڑھے گی۔ اگر نہیں آؤ گے تو نوکری چلی جائے گی۔ لہٰذا تمہاری وہ بیوی تمہیں جانے کی اجازت دے دے گی اور اپنی اولاد کی پیدائش کے دن گننے لگے گی۔"

میری باجی جان اور بہنوئی صاحب نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا مجھے بڑے تجربے کی باتیں سمجھاتے تھے لیکن یہ نہیں سمجھایا کہ شریکِ حیات کے حسن کا یا محبت کا صرف معصومیت کا جادو چل جائے تو اس کا توڑ کیا ہو سکتا ہے۔ ممتاز رو رہی تھی کیونکہ سات ہفتے گزر گئے تھے' دو ماہ پورے ہونے کے لئے صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ میں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "رونا بھول جاؤ اور ہنستی' کھلکھلاتی ہوئی میرے بازوؤں میں چھپ جاؤ' میں تمہیں ایک خوشخبری سنا رہا ہوں۔"

"آپ ساری کائنات میرے قدموں میں رکھ دیں گے اور مجھ سے بچھڑ جائیں گے تو مجھے کوئی خوشی نہیں ہوگی۔ میرے لیے کوئی خبر خوشخبری نہیں ہو سکتی۔"

"تم مجھ سے جتنی محبت کرتی ہو' میں اس سے کم محبت نہیں کرتا۔ میں بھی تم سے جدا نہیں ہونا چاہتا۔ میں نے تمہیں بتائے بغیر اپنی کمپنی میں مزید دو ماہ کی چھٹی کی درخواست دی تھی' جس کا جواب آیا ہے' یہ خط میرے ہاتھ میں ہے اور اس میں لکھا ہے' میں مزید دو مہینے اپنی ممتاز کے پاس رہ سکتا ہوں۔"

یہ سنتے ہی وہ خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ میں اس دیوانگی کو مسرتوں کے اظہار سے نہ روک سکا اسے کھلی چھٹی دے دی۔ جب اس نے جی بھر کر اظہار کر لیا تو میں نے کہا۔ "دو دن کے لئے بچھڑنے والا ہوں۔"

"وہ کیوں؟"

"میں شہر جاؤں گا اور آئی بینک والوں سے ملاقات کر کے معلوم کروں گا۔ تمہارا نمبر کب تک آنے والا ہے۔"

وہ میرے ساتھ شہر جانے کی ضد کرنے لگی۔ میں نے کہا۔ "کچھ روز صبر کر لو جب آنکھیں مل جائیں گی تو میرے ساتھ ایک شہر تو کیا پوری دنیا دیکھو گی۔ ابھی جاؤ گی تو مجھے اتنے بڑے شہر میں قدم قدم پر تمہیں سنبھالنا ہوگا۔ میری ذمے داریاں بڑھ جائیں گی۔"

میں نے اسے پیار محبت سے سمجھایا' وہ سمجھ گئی۔ میں وہاں سے سیدھا باجی جان کے پاس پہنچا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی تاڑ گئیں۔ کہنے لگیں۔ "تم کچھ پریشان ہو' آؤ یہاں بیٹھو۔"

وہ ہمیشہ اپنے پاس صوفے پر بٹھایا کرتی تھیں۔ میں ان کے قدموں میں بیٹھ کر کہنے لگا۔ "آپ نے درست کہا تھا۔ لڑکیاں میکا چھوڑ کر آتی ہیں اور اپنے مرد کو سسرال سے چھڑا کر لے جاتی ہیں' نہ خود اپنے گھر رہتی ہیں نہ شوہر کو امی کے گھر رہنے دیتی ہیں۔ ایک نیا گھر آباد کرتی ہیں پتا نہیں' وہ کب ماں بنے گی لیکن ابھی سے ممتا کا بھرپور اظہار کر رہی ہے۔ اپنے ہونے والے بچوں کے مستقبل کے متعلق دور دور تک سوچ رہی ہے۔"

باجی جان نے کہا۔ "اس کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے' تم کیوں پریشان ہو؟"

"آپ نے کہا تھا' ہر انسان کے پاس اس کا ضمیر ہوتا ہے' اس کا ایمان ہوتا ہے' اگر وہ ذرا بھی ایمان والا ہوتا ہے تو اس کے دل میں خوفِ خدا ہوتا ہے۔"

"بے شک ہم سب کو اللہ سے ڈرنا چاہئے۔ کون جانتا ہے' کب اس کا قہر نازل ہو جائے' اس لئے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہئے جس سے دوسروں کو نقصان پہنچے۔ میں تمہیں ہجے کر کے سمجھا چکی ہوں۔ ممتاز کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ وہ اگر تھوڑا سا نقصان اٹھائے گی تو عمر بھر فائدے میں رہے گی۔ تم اسی طرح اپنے ضمیر کو سمجھاتے رہو ورنہ کوئی حماقت کر بیٹھو گے۔ بائی دا وے' تم کتنے دنوں کے لئے آئے ہو۔"

"اس سے دو دن کا کہہ کر آیا ہوں۔"

میرے بہنوئی نے باجی جان کے کان میں کچھ کہا پھر بولے۔ "آؤ ہادی' میں تمہارے ساتھ لان میں ٹہلنا چاہتا ہوں۔"

میں ان کے ساتھ لان میں آیا وہ آہستگی سے بولے۔ "تمہیں ممتاز کو چھوڑ کر

نہیں آنا چاہئے تھا۔"

"میں صرف دو دن کے لئے آیا ہوں۔"

"میاں صاحبزادے' کسان اپنی زمین پر اس وقت تک ہل چلاتا ہے جب تک کہ زمین بیج قبول کرنے اور فصل اگانے کے قابل نہیں ہو جاتی۔ جب تک وہ قابل نہیں ہوتی' کسان محنت کرتا رہتا ہے۔"

میں تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ ان کے ساتھ ٹہلتا رہا اور ان کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ بات سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں' مہناز کی محبت سے گھبرا کر آیا تھا۔ باجی جان کی پناہ میں تھوڑا وقت گزارنا چاہتا تھا اور یقین کرنا چاہتا تھا کہ باجی جان کا جو رعب و دبدبہ ہے اور ان کا جو اثر مجھ پر ہے مہناز اس طلسم کو نہیں توڑ سکے گی۔

میں واپس آیا۔ ہم شوہروں کو کھونٹوں سے بندھا ہوا بیل کہا جاتا ہے۔ ہم ضد میں آ کر کھونٹے سے خواہ کتنا ہی دور بھاگنا چاہیں صرف رستے کی لمبائی تک جاتے ہیں پھر وہ رستا ہمیں روک دیتا ہے اور ہم پلٹ کر کھونٹے کی طرف چلے آتے ہیں۔ مہناز کی طرف آتے ہوئے محسوس ہوا میں اس کی محبت سے گھبراتا نہیں ہوں بلکہ اس پر بُری طرح مرمٹا ہوں۔ میرا دل کہتا تھا' یہی ایک عورت ہے جو پوری کی پوری میری ہے کوئی اس کی محبت میں حصے دار نہیں ہے۔ یہ صرف میری ہے اور میرے ہی بچے پیدا کرنے کے لئے ہے۔ مجھے باجی جان کے گھر سے خون کا رشتہ ملا ہے اور اچھی خاصی محبت ملی ہے لیکن جو خون کا رشتہ ملا ہے' وہ ماضی کی بات ہے اور جو خون کا رشتہ میری اولاد سے چلنے والا ہے اس کا سرچشمہ مہناز ہے۔ آج مجھے باجی جان کے ہاں سے دولت ملی ہے' کل کہیں اور فراڈ کروں گا تو دولت مل جائے گی' پرسوں کہیں اور ہاتھ مارنا چاہوں گا تو وہاں سے بھی کامیابی ہو اور کچھ دولت حاصل ہو جائے لیکن سچی اور کھری محبت تو مجھے صرف اپنے بچوں کی ماں سے ملے گی۔

میں کشمکش میں تھا نہ مہناز کو چھوڑ سکتا تھا نہ باجی جان سے منہ موڑ سکتا تھا۔ میں ہادی کو آواز دیتا تھا اور ساتھ ہی اسے برا بھلا کہتا تھا۔ اس نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ عورت مہناز بھی ہوتی ہے جو بہن کے گھر میں بھونکنے والے کو انسان بنا دیتی ہے اور محبت کرنا سکھا دیتی ہے۔

ایک دن مہناز نے پوچھا۔ "مشرقِ وسطیٰ سے آنے والے اپنے ساتھ کیمرا ضرور لاتے ہیں' کیا آپ کے پاس کیمرا ہے؟"

"کیا تصویریں اتروانا چاہتی ہو؟"

"ہاں' اگر کیمرا نہیں ہے تو ہم کسی اسٹوڈیو میں جا کر اپنی تصویریں اتروائیں گے۔ جب آپ دوبئی چلے جائیں گے اور مجھے آنکھیں مل جائیں گی تو میں کم از کم تصویروں میں آپ کو دیکھ سکوں گی۔"

اس کی یہ خواہش میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی۔ میں اسے چھوڑ دیتا' اس سے دور ہو جاتا' کبھی اس سے ملنے نہ آتا تو وہ میری تصویر کے ذریعے ڈھونڈنے نکل جاتی پھر شاید کسی دن میرے پاس پہنچ جاتی۔

میرے پاس کیمرا نہیں تھا اور میں اس کے ساتھ کسی اسٹوڈیو میں تصویر اتروا کر آئندہ کسی مصیبت کا راستہ ہموار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ "میرے پاس کیمرا ہے' تمہاری اتنی خواہش ہے تو ابھی جاتا ہوں اور بازار سے فلم خرید کر لے آتا ہوں۔"

میں اس کی دانست میں فلم خریدنے بازار چلا آیا جبکہ میرے پاس کیمرا بھی نہیں تھا اور عارف والا جیسی چھوٹی سی آبادی میں شاید کیمرا کہیں سے نہ ملتا' اگر ملتا تو میں فوراً خرید لیتا۔ میں نے پورے بازار کا چکر لگایا' کوئی فوٹو اسٹوڈیو نظر نہیں آیا۔ بس اڈے پر پہنچا تو ایک فوٹو گرافر سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے کہا۔ "بھائی' مجھے ایک دن کے لئے کیمرا کرائے پر دو جو رقم مانگو گے دوں گا۔"

اس نے ایک بہت ہی پرانے ماڈل کا کیمرا دکھاتے ہوئے کہا۔ "جناب یہی ایک پونجی میرے پاس ہے سستے کے زمانے میں تین سو کا تھا۔ آج پانچ سو سے کم قیمت نہیں ہو گی۔"

میں نے فوراً ہی سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر اسے دیئے پھر کہا۔ "کل اسی وقت یہاں ملاقات کرنا میں تمہارا کیمرا واپس کر دوں گا۔"

اس نے اتنے سارے نوٹ لے کر کہا۔ "جناب واپس کرنے کی کیا ضرورت ہے' اپنے پاس رکھ لیجئے میں دوسرا خرید لوں گا۔"

میں' ممتاز کے پاس آیا' اس کے ہاتھوں میں کیمرا رکھ کر بولا۔ "اس میں فلم لوڈ ہے' تیار ہو جاؤ' ہم تصویریں اتاریں گے۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا ہماری ایک ساتھ تصویر اتر سکتی ہے' اسے اتارنے کے لئے تو کسی تیسرے آدمی کی ضرورت ہو گی؟"

"یہ آٹو میٹک کیمرا ہے' میں اس میں ٹائمنگ سیٹ کر دوں گا پھر تمہارے پاس آجاؤں گا' تصویر اتر جائے گی۔"

وہ تصویر اتروانے کے لئے جلدی جلدی تیار ہونے لگی۔ میک اپ کرنے لگی' لباس بدلنے لگی۔ ایسے وقت میں اس کی مدد کرتا تھا کیونکہ وہ تنہا یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "میرا میک اپ اچھی طرح کیا ہے نا' ایسا تو نہیں ہے کہ میں کارٹون کی طرح نظر آؤں؟"

"کیا میں تصویر میں تمہیں کارٹون بناؤں گا تم نہیں جانتیں' یہ تصویر لے کر میں دوبئی جاؤں گا' اپنے دوستوں کو دکھاؤں گا اور فخر سے پوچھوں گا' ہے کسی کی بیوی اتنی حسین اور دل نشین؟"

وہ خوشی سے کھل رہی تھی پھر تیار ہو کر ایک طرف آکر صوفے پر بیٹھ گئی۔ میں نے کہا۔ "اسی طرح بیٹھی رہو' میں کیمرا سیٹ کر رہا ہوں۔"

کیمرے میں سرے سے فلم نہیں تھی' بس اسے بہلانے والی بات تھی۔ میں چند سیکنڈ کے بعد اس کے پاس صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ مزید چند سیکنڈ کے بعد کہا۔ "ہماری تصویر اتر گئی ہے۔"

اس کے بعد ہم دونوں نے کئی پوز اختیار کئے اور میں نے ہر پوز کے بعد اسے یقین دلایا کہ تصویریں اترتی جا رہی ہیں۔ میں نے لاری اڈے میں ایک دکان دیکھی تھی جہاں فلم اسٹاروں کی پوسٹ کارڈ سائز کی تصویریں فروخت ہوتی تھیں۔ دوسرے دن میں وہ تصویریں خرید کر لے آیا پھر انہیں ممتاز کے ہاتھوں میں رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ ہماری تصویریں ہیں۔"

وہ ان تصویروں کو ہاتھوں میں لے کر خوش ہوئی پھر ایک دم سے اداس ہو گئی۔ اسے میرے ساتھ تصویریں اتروانے کا بے حد شوق تھا لیکن وہ تصویریں دیکھ نہیں سکتی

تھی۔ میں نے بڑے پیار سے سمجھایا۔ "اداس ہونے کی کیا بات ہے' جلد ہی دیکھنے لگو گی۔ میری یہ تمام تصویریں تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوں گی لیکن ایک بات یاد رکھو' یہ ہم میاں بیوی کی تصویریں ہیں اور بڑے ہی پیار بھرے انداز میں اتاری گئی ہیں لہٰذا کسی تیسرے کو نہ دکھانا۔"

"کیا بے شرم سمجھتے ہیں' میں انہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گی۔ ایسی جگہ چھپاؤں گی کہ کسی کی نظر نہیں پڑے گی۔"

میں مطمئن ہو گیا اب وہ فلم اسٹاروں کی تصویریں کوئی تیسرا نہیں دیکھ سکے گا۔ جب وہ دیکھے گی اور اس کے بعد کوئی اور دیکھے گا' اس وقت تک پانی سر سے گزر چکا ہو گا۔

بے شک میں ممتاز سے فراڈ کر رہا تھا لیکن اپنے ضمیر کو سمجھا رہا تھا' یہ اس کی بہتری کے لئے کر رہا ہوں' مجھ جیسا فراڈ انسان اس کا جیون ساتھی بننے کے قابل نہیں ہے۔ جب میں اسے چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور باجی جان اسے اتنا کچھ دیں گی کہ یہ اپنے طور پر اپنی زندگی سنوار سکے تو اپنے لئے بہترین جیون ساتھی بھی تلاش کر لے گی۔ مختصر یہ کہ کسی کا فراڈ کسی کو برباد کر دیتا ہے۔ میرا فراڈ اسے آباد کر دے گا۔ میں ایسی باتیں بار بار کر رہا ہوں۔ دراصل میں کسی کو سنا نہیں رہا ہوں۔ اپنے آپ کو تسلی دے رہا ہوں۔ میرے اندر جو مجرم چھپا ہوا ہے' اسے چھپائے رکھنے کے لئے مجھے بہت سی باتیں بنانا پڑتی ہیں اور جب تک باجی جان سے میرا مفاد وابستہ رہے گا' میں ایسی باتیں بناتا رہوں گا۔

تین ماہ گزر گئے۔ چوتھے ماہ کا پہلا ہفتہ بھی گزر رہا تھا۔ میں پریشان ہو رہا تھا کب تک ایسی آزمائشوں سے گزرتا رہوں گا کب تک بیوی اور بہن کے درمیان کش مکش میں مبتلا رہوں گا۔ تین ماہ بعد میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہونے لگی کہ میری باجی جان کی طرح ممتاز بھی بنجر ہو جائے' بانجھ ہو جائے' کبھی ماں نہ بنے' نہ یہ ماں بنے گی' نہ ہمارا فراڈ اسے تباہ کرے گا پھر میں ایک دن باجی جان کو راضی کر لوں گا کہ اس سے تو کوئی بچہ حاصل نہیں کرنا ہے چونکہ یہ میری شریکِ حیات بن چکی ہے لہٰذا شریکِ حیات رہنے دیا جائے جہاں تک بچے کا تعلق ہے۔ میں دوسری شادی کر لوں گا۔ میری

دوسری بیوی سے فراڈ کیا جائے۔ مجھے دکھ نہیں پہنچے گا مگر جانے کیوں ممتاز راستہ ٹٹولتے وقت کبھی لڑکھڑاتی ہے' گرنے والی ہوتی ہے تو میرے دل اور دماغ کو جھٹکا سا پہنچا ہے اور میں لپک کر اسے سہارا دیتا ہوں۔ میں اسے ٹھوکر کھاتے نہیں دیکھ سکتا۔

میں نے ایک رات گڑگڑا کر دعا مانگی۔ "میرے معبود! میں بہت گناہ گار ہوں۔ میں نہیں جانتا کس وقت تجھ سے خوف کھانا چاہئے اور کس وقت اپنے مفاد کی خاطر تجھے بھلا دینا چاہئے۔ میں جیسا بھی ہوں تیرا بندہ ہوں' میری ایک دعا قبول کرلے۔ ممتاز کو بانجھ کردے' اس سے کوئی اولاد نہ ہو۔"

جس رات میں نے یہ دعا مانگی اس کی صبح میں نے باتھ روم میں ممتاز کو قے کرتے ہوئے سنا پھر وہ لڑکھڑاتی ہوئی باتھ روم کے دروازے پر آئی میں نے سہارا دیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

اس نے کہا۔ "کچھ نہیں سر چکرا رہا ہے۔"

اس کے بعد میں نے سنا اسے متلی سی ہو رہی ہے اور کھٹا کھانے کو جی چاہتا ہے۔ صبح اس کا سر چکرا رہا تھا' اب یہ ساری باتیں سن کر میرا سر چکرانے لگا۔ اس لمحے پتا چلا' باپ بننے کی خوشی کیا ہوتی ہے۔ جب پہلی بار کسی نے بیج بو کر اپنے آنگن میں پھول کھلایا ہوگا تو پہلا پھول دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی ہوگی۔ جب پہلی بار کسی مہم جو نے کسی مدفون خزانے کا سراغ لگایا ہوگا کہ وہ خزانہ فلاں جگہ زمین کی تہہ میں چھپا ہوا ہے تو اسے کتنی خوشی ہوئی ہوگی' اس طرح میں دیکھتا تھا' میری ممتاز کے وجود میں میری آئندہ نسل کا خزانہ چھپا ہوا ہے تو میں اپنی خوشی کی انتہا بیان نہیں کرسکتا تھا۔

بہار اور برسات میں مور بڑی خوشی سے' بڑی مستی میں ناچتا ہے پھر ناچتے ناچتے اسے بھدے پاؤں نظر آتے ہیں تو وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتا ہے۔ میرے پاؤں' باجی جان کی گرفت میں تھے۔ وہ میری ٹانگ پکڑ کر کھینچتیں تو میں اوندھے منہ گر پڑتا۔ میں زندگی کے ایسے موڑ پر تھا جہاں ایک طرف ممتاز کے لئے جذبات تھے' دوسری طرف باجی جان کی مہربانیاں تھیں جن کی بدولت میں زندگی کو اس کی پوری شان و شوکت کے ساتھ گزار رہا تھا۔ مجھے بہت سوچ سمجھ کر ایک راستہ اختیار کرنا تھا۔ اپنی ممتاز کا راستہ یا اپنی باجی جان کا راستہ۔

ان حالات میں دل کی دھڑکنوں سے کام لینا اور جذبات کی رو میں بہنا سراسر نادانی ہوتی۔ میں نے ایک سادہ کاغذ ممتاز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے افسوس ہے' کمپنی کو میری ضرورت پڑ گئی ہے۔ انہوں نے وارننگ دی ہے اگر میں ایک ہفتے کے اندر نہ پہنچا تو میری ملازمت ختم کردی جائے گی۔"

یہ سن کر وہ رونے لگی۔ "رونے سے کیا ہوتا ہے۔ پردیس میں کام کرنے والے شوہر کو ہنستے روتے رخصت کرنا ہی پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے یہاں سے کراچی جانا ہوگا' وہاں سے دوبئی جاؤں گا۔ کافی وقت لگے گا' اس لئے میں کل روانہ ہو رہا ہوں۔"

اس رات وہ روتی رہی اور کہتی رہی۔ "آج میں خوشخبری سنانے والی تھی۔ تم نے بڑی خبر سنادی۔ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں اور تم جا رہے ہو۔"

"ممتاز ایک دن تو مجھے جانا ہی تھا۔ میں تمہارا جیون ساتھی ضرور ہوں لیکن پردیسی بھی ہوں۔ پردیس میں ملازمت کرتا ہوں۔ اپنی ڈیوٹی کا پابند ہوں۔"

اس نے پوچھا۔ "میری آنکھوں کا کیا ہوگا؟"

"میں وعدہ کرتا ہوں' میرے بعد ابا جان شہر جایا کریں گے اور تمہاری آنکھوں کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کرتے رہیں گے انشاء اللہ تم بہت جلد دیکھنے لگو گی۔"

اس کی آنکھیں میری طرف تھیں جیسے وہ بے نور آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی ہو۔ اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ "میری خواہش ہے' میں سب سے پہلے آپ کو دیکھو' مگر آپ نہیں ہوں گے' آپ کی تصویریں دیکھوں گی۔ یہ کتنا پرانا گیت ہے' تصویر تیری دل میرا بہلا نہ سکے گی' یہ کتنی سچی بات ہے۔ دل کے معاملے میں یہ گیت ہمیشہ نیا ہو جاتا ہے۔"

وہ بول رہی تھی اور دونوں ہاتھوں سے میرے چہرے کو چھو رہی تھی پھر اس نے میرے ہونٹوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "آپ ان ہونٹوں سے میری بے نور آنکھوں کی کتنی تعریف کرتے ہیں۔ جب ان میں نور آئے گا تو آپ کو یہ آنکھیں اور زیادہ حسین لگیں گی۔ میں ان آنکھوں کو چھپاؤں گی' جب تک آپ نہیں آئیں گے اور میری آنکھوں کو نہیں دیکھیں گے' تب تک میں ساری دنیا سے ان آنکھوں کے

حسن کو چھپاؤں گی۔ سیاہ عینک پہن کر رہوں گی۔"

جس کے پیار میں سچائی ہوتی ہے' اس کی باتیں دوست پر بھی اثر کرتی ہیں اور دشمن پر بھی۔ میں ابھی تک اس فیصلے پر قائم تھا کہ دشمن نہیں ہوں' اس کا دوست ہوں' اسے میری ذات سے نقصان نہیں پہنچے گا۔ وہ بالآخر فائدے میں رہے گی۔ میں پیار و محبت سے سمجھا بجھا کر اس سے رخصت ہوگیا۔ سیدھا باجی جان کے پاس آگیا۔ انہیں یہ خوشخبری پہلے ہی مل گئی تھی۔ بہنوئی صاحب نے میری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔ "شاباش! تم نے تو کمال کردیا۔ شادی کے سات برس میں جو میں نہ کرسکا' وہ تم نے کر دکھایا۔ بھئی قدرت جس کو نوازے وہی بچے کا باپ بنتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "جی ہاں' قدرت آپ کو نواز رہی ہے کیونکہ آپ ہی بچے کے باپ بننے والے ہیں۔"

"کیا وہ تمہیں یاد آرہی ہے؟"

"ایک حسین عورت چار ماہ دن رات ساتھ رہے تو جدائی کے بعد یاد تو آئے گی۔"

"کیا اس کے پاس جانا چاہتے ہو؟"

"باجی کے حکم کا پابند ہوں' انہوں نے سختی سے منع کیا ہے۔ میں اُدھر کا رخ نہیں کروں گا۔"

باجی نے خوش ہوکر کہا۔ "شاباش! مجھے اپنے بھائی پر فخر ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "مجھے بھی اپنی بہن پر فخر ہے' جس نے میرے بچے کو پیدا ہونے سے پہلے ہی گود لے کر کروڑ پتی بنا دیا ہے۔"

میں ممتاز سے ہمیشہ کے لئے دور ہوگیا تھا مگر اس کی خبر ملتی رہتی تھی۔ باجی جان کے حکم کے مطابق کبھی ابا جان اور کبھی امی جان پندرہ دن میں ایک بار لاہور آتے تھے اور اس کے بارے میں یقین دلاتے تھے کہ وہ بخیریت ہے' صحت مند ہے۔ ہادی کو یاد کرتی ہے اور اس کے خط کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا۔ "جب بھی آپ کا خط آیا کرے گا' میں اسے سنبھال کر رکھ لوں گی۔ لفافہ نہیں کھولوں گی' کسی سے نہیں پڑھواؤں گی۔ جانے آپ کیسی راز و نیاز کی باتیں لکھیں گے۔ مجھے دوسروں

سے خط پڑھواتے ہوئے شرم آئے گی۔"

باجی جان نے ابا جان سے کہا۔ "ہر پندرہ دن کے بعد ایک لفافے میں سادہ کاغذ ڈال کر اسے دے دیا کریں۔ اگر وہ خط پڑھ کر سنانے کے لئے کہے تو اسے تسلی کے الفاظ سنا دیا کریں۔"

میں نے کہا۔ "ابا جان' وہ مجھ سے کہہ چکی ہے' میرا جو بھی خط آئے گا وہ لفافہ نہیں کھولے گی۔ جب اسے آنکھوں کی روشنی ملے گی تو خود ان خطوط کو پڑھا کرے گی۔"

"یہ اور اچھی بات ہے' اسے ہر بیس دن بعد ایک بند لفافہ دے دیا کریں۔"

ادھر بہنوئی صاحب نے اپنے رشتے داروں میں یہ بات پھیلا دی تھی کہ بیگم رخسانہ یعنی میری باجی کے پاؤں بھاری ہوگئے ہیں۔ ان کے بہت سے عزیزوں کے لئے یہ بہت بُری خبر تھی وہ آس لگائے بیٹھے ہوئے تھے کہ کنور آفتاب احمد اپنے کسی بھتیجے یا بھانجے کو گود لیں گے اور اسے اپنی جائیداد کا وارث بنائیں گے۔ یہ بُری خبر سننے کے باوجود وہ اوپری دل سے ظاہر کررہے تھے کہ یہ خوشخبری ہے۔ رشتے دار مبارک باد دینے کے لئے آنے جانے لگے تھے اور پوچھا کرتے تھے' ہماری ضرورت ہو تو ہم کوٹھی میں رہ جائیں۔ ایسی حالت میں بیگم رخسانہ کو زیادہ سے زیادہ آرام کرنا چاہئے اور ان کی خدمت کے لئے قریبی رشتے داروں کو موجود رہنا چاہئے۔

کنور آفتاب احمد نے کہا۔ "میں رخسانہ کی زچگی سے چند ماہ پہلے ہی اسے ملک سے باہر لے جاؤں گا' ہم صحت افزا مقامات کی سیر کرتے رہیں گے میری بیگم کی زچگی سوئٹزرلینڈ میں ہوگی۔"

کنور آفتاب احمد کا یہ جواب سن کر رشتے داروں کی بھیڑ چھٹ گئی۔ ممتاز کی زچگی کے چھ ماہ پہلے ہی باجی جان اور بہنوئی نے ملک چھوڑ دیا۔ چھ ماہ بہت ہوتے ہیں لیکن میرے بہنوئی اور باجی جان کے لئے کم تھے کیونکہ یورپ کے کتنے ہی ملکوں میں اپنے کاروبار اور بینک بیلنس کا حساب کرنا تھا' انہوں نے جانے سے پہلے مجھے ڈیڑھ لاکھ روپے دیئے تھے کیونکہ ممتاز کو ہر ماہ دس ہزار روپے یہ کہہ کر بھیجے جاتے تھے کہ دوبئی سے اس کے شوہر کی کمائی آرہی ہے۔ باجی جان کی سخاوت رحم دلی اور خدا ترسی کا

جواب نہیں ہے اور مہناز سے کچھ لینے سے پہلے اسے بہت کچھ دیتی جارہی تھیں۔

ان کے جانے کے بعد اچانک احساس ہوا کہ میں تنہا رہ گیا ہوں میری ماں اور میری اَن داتا مجھ پر حکم چلانے والی مالکہ میرے سر پر مسلط نہیں ہے میرے پاؤں کی زنجیریں کٹ گئی ہیں۔ میں کسی وقت بھی مہناز کے پاس جاسکتا ہوں۔ نہیں' پاس جانے سے کھیل بگڑ جائے گا۔ میں دور ہی دور سے دیکھ سکتا ہوں' اپنی آنکھوں کی پیاس بجھا سکتا ہوں۔ میں اس خواہش کو دل اور دماغ سے نکال رہا تھا۔ کوشش کررہا تھا' وہ یاد نہ آئے لیکن یاد تو بے اختیاری چیز ہے۔ آپ ہی آپ آتی ہے اور جب آتی ہے تو اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوجاتا ہے۔

دل نہیں مان رہا تھا۔ اس کے لئے مچل رہا تھا۔ اگر کوئی رکاوٹ نہ ہوتی تو میں فوراً ہی عارف والا پہنچ جاتا' خواہ دور ہی دور سے دیکھتا رہتا لیکن اس علاقے میں زیادہ جانا پہچانا نہیں تھا۔ اگر میں اس کے پاس گھر کے اندر نہ جاتا اور باہر ہی سے تاکتا رہتا تو لوگوں کو شبہ ہوتا' طرح طرح کے سوالات کئے جاتے جن کا ایک جواب بھی میرے پاس نہ ہوتا۔ میں اپنی بیوی کے پاس گھر میں نہ جاؤں اور دور ہی دور سے ایک شکاری کی طرح اس کی تاک میں رہوں تو پولیس والے بھی میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔

لیڈی ڈاکٹر کے حساب سے مئی کے آخر میں جون کے پہلے یا دوسرے ہفتے میں زچگی ہوسکتی تھی۔ ان دنوں میدانی علاقوں میں سخت گرمی پڑتی ہے' اسی لئے مری میں پہلے سے ایک کاٹیج ریزرو کرایا گیا تھا۔ یوں تو کتنے ہی پہاڑی مقامات اور شہروں میں ہمارے کاٹیج اور بنگلے تھے۔ بہنوئی صاحب نے تاکید کی تھی کہ اس مقصد کے لئے اپنا کوئی بھی ذاتی بنگلا یا کاٹیج استعمال نہ کیا جائے۔ اندیشہ تھا کہ کسی بھی کاٹیج یا بنگلے کے ذریعے ہماری نشاندہی ہوسکتی ہے۔

زچگی کے قریب باجی اور بہنوئی صاحب چپ چاپ اسلام آباد پہنچ گئے پھر وہاں سے مری آگئے۔ ان کا ذاتی کاٹیج اس کاٹیج کے قریب ہی تھا' جہاں مہناز کے ساتھ اماں جان اور ابا جان رہائش اختیار کئے ہوئے تھے۔ مہناز کے لئے کسی دائی یا لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں تھی۔ آج سے تقریباً آٹھ برس پہلے جب ہم مفلسی اور محتاجی کی زندگی گزار رہے تھے تو ہماری اماں جان ایک اسپتال میں نرس تھیں اور میٹرنٹی کے شعبے میں

دایہ کے فرائض بھی انجام دیتی تھیں۔ ابا جان شروع سے ہی آرام طلب ہیں۔ ویسے تو میں بھی آرام طلب ہوں' وہ میری ماں کی کمائی کھاتے تھے' میں بہن کی کمائی کھاتا ہوں یعنی ہمارے خاندان میں عورتیں کماتی ہیں اور مرد کھاتے ہیں۔ بہرحال باجی جان نے کنور آفتاب احمد کو شادی کے بندھن میں باندھ کر ہمارے دن پھیر دیئے تھے۔

مجھے لاہور والی کوٹھی کی نگرانی کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں بہت بے چین تھا۔ روز رات کے وقت فون پر باجی سے باتیں کرتا تھا اور بچے کے متعلق پوچھتا تھا وہ بتاتی تھیں۔ "بس آج کل میں میری گود بھرنے ہی والی ہے۔"

پتہ نہیں کیوں' یہ بات سن کر میں پریشان ہوجاتا تھا۔ یہ پریشانی مہناز کے لئے تھی۔ پتا نہیں بے چاری پر کیا گزر رہی ہوگی۔ میں اسے تصور میں دیکھتا تھا۔ دھواں دھواں سے ماحول میں وہ ایک بستر پر پڑی تڑپتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اتنی بڑی دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا۔ ایک بوڑھا باپ تھا جو بیٹی کی زچگی کے وقت آنہیں سکتا تھا۔ پرانے زمانے اور پرانے خیالات کا آدمی تھا۔ ایسے وقت بیٹی کے قریب رہنے میں شرم محسوس کرتا تھا۔

دوسری صبح فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ باجی جان خوشی سے چہکتی ہوئی کہہ رہی تھیں۔ "بیٹا ہوا ہے' ماشاء اللہ بہت ہی خوبصورت ہے۔"

میں نے خوش ہوکر بے اختیار کہا۔ "کیا میں باپ بن گیا ہوں؟"

باجی نے بہت ہی سخت لہجے میں کہا۔ "یو شٹ اپ' میں شام تک آرہی ہوں۔ آتے ہی جب دس جوتے ماروں گی تب تمہیں یاد آجائے گا کہ کنور آفتاب احمد کے بیٹے نے جنم لیا ہے۔"

"باجی جان! مجھ سے بڑی بھول ہوئی' بے اختیار زبان سے نکل گیا تھا۔ آپ فون پر دیکھ نہیں سکتی' ہاتھ جوڑ رہا ہوں' معافی مانگ رہا ہوں' کان پکڑ رہا ہوں۔ توبہ کررہا ہوں۔ آپ میری اس بات کو یوں سمجھ لیجئے کہ ماموں بھی آخر باپ کے برابر ہوتا ہے' میں اپنے بھانجے کی پیدائش پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔"

انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ میں تھوڑی دیر تک یونہی ریسیور پکڑے کھڑا رہا' سوچتا رہا۔ بیٹا پیدا بھی ہوا اور باجی جان کی گود میں بھی پہنچ گیا۔ مہناز کو ایک دن خالی

ہوناتھا' وہ خالی ہو گئی۔ پچھلی رات بچے کی ولادت کے سلسلے میں جو ڈراما کھیلا گیا تھا' اس کی اہم کردار ہماری اماں جان تھیں۔ انہوں نے باجی جان سے کہہ دیا تھا۔ "ممتاز شاید ایک آدھ بار بچے کی آواز سن پائے گی' اس کے بعد اسے گہری نیند آجائے گی۔ زچگی ہوتے ہی میں اسے نیند کا انجکشن دے دوں گی۔ جب وہ چار چھ گھنٹے بعد سو کر اٹھے گی تو اسے یہ بُری خبر سنائی جائے گی کہ بچہ پیدا ہونے کے چند منٹ بعد ہی چل بسا تھا۔ اس کے سسر بچے کو دفن کرکے آگئے ہیں۔"

نیند کا انجکشن اس لئے ضروری تھا کہ وہ جاگتی رہتی تو بچے کو دیکھنا چاہتی اگر کہا جاتا کہ وہ مرچکا ہے تو پھر بھی اس کے مُردہ جسم کو چھونے کی کوشش کرتی۔ آخر ماں ہے' چیزوں کو ٹٹول کر یہ سمجھنے کی کوشش کرتی کہ بچے کا ناک نقشہ کیسا ہے۔

رات کو باجی جان اور بہنوئی' بچے کے ساتھ آگئے تھے۔ میں نے دیکھا بچہ بہت خوبصورت تھا۔ میں اسے گود میں لینا چاہتا تھا لیکن باجی جان سے یہ کہنے کی جرأت نہیں تھی۔ وہ بچے کو سینے سے لگائے ہوئے تھیں' اور بہت خوش نظر آرہی تھیں۔ اس گھر میں ان کے پاؤں مضبوطی سے جم گئے تھے۔ اب کوئی سوکن ان کے شوہر کی محبت میں شریک ہونے اور ان کی دولت اور جائیداد میں حصے دار بننے نہیں آسکتی تھی۔ انہوں نے بتایا' ممتاز آٹھ گھنٹے بعد بیدار ہوئی تھی اور بیدار ہوتے ہی بچے کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ رپورٹ اماں جان نے دی تھی اور انہوں نے ممتاز کو سمجھایا تھا کہ وہ صبر کرے' بچہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔

یہ سن کر ممتاز کس طرح تڑپ گئی ہوگی' اس کا کیا حال ہوا ہوگا' یہ تو نہ اماں جان نے رپورٹ دی' نہ ہی باجی جان اس کے بارے میں کچھ سوچنا چاہتی تھیں لیکن میرے دل میں درد اٹھ رہا تھا۔ اس نے روتے ہوئے اماں جان سے کہا تھا۔ "میں تقدیر سے نہیں لڑ سکتی' میں بہت بدنصیب ہوں کم از کم بچے کو میرے پاس لے آئیں میں اسے چھو کر دیکھنا چاہتی ہو۔"

اماں نے جواب دیا۔ "کیا پاگل ہو گئی ہو! تم آٹھ گھنٹے تک سوتی رہی ہو' کیا ہم بھی آٹھ گھنٹے تک اس کو یہیں پڑا رہنے دیتے؟ گھر میں نوزائیدہ بچے کی میت زیادہ دیر نہیں رہنی چاہئے' اسی لئے تمہارے سسر نے اسے دفن کردیا ہے۔"

اماں جان نے اسے تھوڑی دیر رونے دیا پھر تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تم سے ایک خوشی چھن گئی مگر دوسری خوشخبری سنو۔ آئی بینک والوں کا خط آیا ہے۔ اگلے ماہ کی دس تاریخ کو تمہاری آنکھوں کا آپریشن ہے۔ اللہ سے دعا کرو تمہیں آنکھوں کی روشنی مل جائے۔ اولاد کی محرومی دل سے نکال دو' ابھی تم جوان ہو' ماشاء اللہ ساری زندگی پڑی ہے' کتنے ہی بچوں کی ماں بن جاؤ گی۔"

اُدھر ماتم تھا' اِدھر خوشی تھی۔ باجی جان اور بھائی جان نے بچے کی پیدائش پر جشن منانے کا اہتمام کیا تھا۔ پورے گھر کو رنگ برنگے قمقموں سے سجایا گیا تھا۔ رشتے دار' دوست احباب اور بڑے بڑے سرکاری افسر آکر مبارک باد دے رہے تھے میرے دل پر ایک بوجھ تھا' میں اس بوجھ کو بار بار اتار کر پھینکتا تھا۔ اکثر ہماری زندگی میں ایسا ہوتا ہے' جب ہم کوئی غلط یا ناجائز کام کرتے ہیں تو اپنے آپ کو سمجھاتے ہیں' یہ غلط نہیں ہے۔ اس کے لئے دلائل پیش کرتے ہیں اور یہ سب کچھ اس لئے کرتے ہیں کہ اس غلط ناجائز کام کی بدولت ہمیں منافع حاصل ہوتا ہے۔ آخر ہم منافع کمانے کے لئے تو دنیا میں آتے ہیں۔ اگر پیدائش سے پہلے یہ کہہ دیا جائے کہ دنیا میں جاکر نقصان اٹھاؤ گے تو میں یقین سے کہتا ہوں' انسان پیدا ہونے سے انکار کردے گا۔

ایک ماہ بعد اماں جان اور ابا جان واپس آگئے۔ انہوں نے بتایا' ممتاز کی آنکھوں کا آپریشن ہوچکا ہے۔ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے' اس سے پہلے کہ پٹی کھولی جاتی' وہ دونوں چپ چاپ چلے آئے تھے۔ باجی جان نے انہیں پانچ ہزار روپے دیئے پھر کہا۔ "آپ لوگ کراچی والی کوٹھی میں جاکر رہیں اور کم سے کم باہر نکلا کریں۔"

ممتاز کے بہت کم رشتے داروں نے اور بسم اللہ بستی کے لوگوں نے شادی کے وقت مجھے اور میرے والدین کو دیکھا تھا۔ ہم میں سے کسی کی تصویر ان کے پاس نہیں تھی' وہ ہمارے خلاف صرف رپورٹ لکھوا سکتے تھے یا زیادہ سے زیادہ حلیہ بتا سکتے تھے۔ اس حلیے سے ہمیں تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔ بہرحال ایسا کوئی برا وقت آتا تو میرے بہنوئی صاحب وسیع ذرائع کے مالک ہیں وہ اپنے اثر ورسوخ سے اور دولت سے بگڑی ہوئی بات بنا سکتے تھے۔

میرے لئے ایک نئی مصیبت پیدا ہوگئی تھی۔ پہلے تو میں ممتاز کے خیال سے پیچھا

چھڑانے کے لئے زیادہ سے زیادہ باجی کے قریب رہتا تھا اس طرح ان کی محبت اور ان کا رعب و دبدبہ مجھے کسی اور کے متعلق سوچنے کی مہلت نہیں دیتا تھا۔ اب میرا بیٹا ان کی گود میں آگیا تھا' اس بیٹے کو ممتاز نے جنم دیا تھا' اسے جب بھی دیکھتا تھا' اس کے رونے کی آواز سنتا تھا تو مجھے ممتاز روتی ہوئی سنائی دیتی تھی۔

میں نے باجی جان سے کہا۔ "میں کراچی جاکر رہنا چاہتا ہوں۔ وہاں اماں جان اور ابا جان بھی ہیں۔ اگر آپ اور بھائی صاحب میری رہنمائی کریں گے تو میں کوئی اچھا سا کاروبار کرلوں گا۔"

بہنوئی نے کہا۔ "تم نے ہمارے منہ کی بات چھین لی ہے ہم خود چاہتے ہیں تم ہمارے بچے سے دور چلے جاؤ۔ یہاں رہو گے تو بے اختیار کوئی بات منہ سے نکل جائے گی' تمام راز فاش ہوجائے گا۔"

باجی جان نے کہا۔ "آپ یہ تو بتائیں' میرا بھائی وہاں جاکر کیا کرے گا؟"

انہوں نے کہا۔ "یہ زیادہ سے زیادہ دو چار لاکھ سے کاروبار شروع کرے گا لیکن اس میں منافع کیا ہوگا؟ ہاں کھانے' پینے کا خرچ نکل آئے گا۔ ویسے میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے میں اسے عملی جامہ پہنانا چاہتا ہوں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میں ایک بدنام اسمگلر ہوں' جب تک بڑے بڑے افسران کو کھلا پلا رہا ہوں اور جب تک میرے پاس دولت کی چکاچوند ہے' لوگوں کے منہ بند رہیں گے لیکن میں نہیں چاہتا کہ ہماری اولاد اسمگلر بنے میں اپنے بیٹے کنور نعیم آفتاب کے نام سے دنیا کے ہر بڑے شہر میں فائیو شار ہوٹل تعمیر کرانا چاہتا ہوں۔ اس کی ابتدا کراچی' لاہور اور اسلام آباد سے ہوگی۔ کراچی میں جو ہوٹل ہوگا۔ اس کا انچارج ہادی ہوگا اور یہ ہمارے ففٹی پرسنٹ کا پارٹنر بھی رہے گا۔"

باجی جان نے کہا۔ "آپ ہوائی قلعے بناتے ہیں لیکن میرے بیٹے کے لئے بنا رہے ہیں' اس لئے خوشی ہو رہی ہے۔ دنیا کے تمام بڑے شہروں میں فائیو شار ہوٹل بنانا کوئی معمولی بات ہے؟ مانا کہ ہمارے پاس کروڑوں روپے ہوں گے لیکن یہ بھی کم ہیں۔"

"اسی لئے تو کہتا ہوں کہ ہم فائیو شار کی ابتدا اپنے ملک کے تین اہم شہروں سے کریں گے پھر رفتہ رفتہ دوسرے شہروں میں کاروبار پھیلائیں گے اور یہ کاروبار

ہمارے بیٹے کنور نعیم آفتاب احمد کے نام ہوگا۔"

میں ان کے منصوبوں پر عمل کرنے کراچی آگیا۔ مجھے بزنس سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو بہت پہلے ہی کوئی نہ کوئی کاروبار کرتا۔ مجھے مفت کی کھانے کی عادت تھی اور مفت کی آمدنی ہاتھ آرہی تھی۔ جب تک باجی جان سلامت ہیں' ایسی آمدنی کا سلسلہ سلامت رہے گا۔ دراصل میں اپنے بیٹے سے دور بھاگ کر آیا تھا۔ پہلے ممتاز سے بھاگتا تھا' اب بیٹے نے بھی بھگانا شروع کردیا تھا۔ میں ان ماں بیٹے سے دور رہ کر ہی شاید سکون حاصل کرسکتا تھا۔

فائیو اسٹار ہوٹل کے لئے ایک بہت بڑا پلاٹ خریدا گیا۔ اس کا بجٹ بن رہا تھا۔ بہنوئی صاحب کے چیف اکاؤنٹنٹ نے جب لمبا چوڑا بجٹ تیار کیا تو فائیو اسٹار کے خیال سے باز آنا پڑا۔ یہ طے پایا کہ پہلے فور اسٹار ہوٹل کا تجربہ کیا جائے گا۔ اس سے منافع ہوتا رہے گا تو فائیو اسٹار کی طرف قدم بڑھایا جائے گا۔ بہرحال ہوٹل کی تعمیر ہونے لگی۔ میں اس میں مصروف ہوگیا۔

وہ ہوٹل ایک برس میں تعمیر ہوا' بہت خوبصورت ہوٹل بنایا گیا۔ تجربہ کار ملازموں کو رکھا گیا۔ چھ ماہ کے اندر ہی یقین کی حد تک اندازہ ہوگیا کہ ہوٹل کے کاروبار میں زبردست منافع ہے پھر تو بہنوئی صاحب نے لاہور اور اسلام آباد میں بھی ہوٹلوں کی تعمیر شروع کردی۔ میں نے دلی سکون کے لئے کراچی میں رہائش اختیار کی تھی لیکن وہاں بھی سکون حاصل نہ ہوا۔ اس دوران میں ضرورت کے تحت باجی جان سے ملنے لاہور جاتا تھا۔ وہاں اپنے بیٹے کو دیکھتا تھا۔ ایسی بات نہیں ہے کہ بیٹے کو دیکھنے سے ہی ممتاز یاد آتی تھی' وہ تو کسی وقت بھی خیالوں میں چلی آتی تھی' یہ دوسری بات ہے کہ بیٹے کو دیکھ کر اس کی محرومی کا شدت سے احساس ہوتا تھا۔ جو بچہ اس کی گود میں ہونا چاہئے تھا' وہ میری بہن کی گود میں تھا' اب تو وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلنے لگا تھا۔ اس کے نام اور مرتبے کے لئے اس کی عزت اور وقار کو بڑھانے کے نئے نئے جتن کئے جارہے تھے۔ جس طرح بہنوئی صاحب اپنے اسمگلنگ کے دھندے سے بیٹے کو الگ رکھنے کے لئے ہوٹل کا شریفانہ کاروبار پھیلا رہے تھے' اسی طرح اب نئے سرے سے شجرہ بنایا جارہا تھا۔ ویسے وہ ایک نامور سید خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ چونکہ

اسمگلنگ کے دھندے میں پڑ گئے تھے' اس لئے سید کا لفظ اپنے نام سے ہٹا کر کنور رکھ لیا تھا۔ اب اپنے بیٹے کی خاطر پھر سید گھرانے کی طرف لوٹ رہے تھے اور بھولا بسرا شجرہ یاد کر کے لکھتے جا رہے تھے تاکہ تحریر کی صورت میں ہو اور آئندہ نہ بھول سکیں۔

میں نے باجی جان سے کہا۔ "میں اب کراچی میں نہیں رہوں گا۔ یہاں لاہور والا ہوٹل سنبھالوں گا۔"

"میں محسوس کر رہی ہوں تم الجھے الجھے سے رہتے ہو۔ تم مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاتے تھے لیکن اچانک کراچی چلے گئے۔ مانا کہ مجھ سے ملنے آیا کرتے ہو لیکن تم نے دانستہ یا نادانستہ مجھ سے دوری اختیار کر لی ہے یا شاید میرے بیٹے سے دور رہنا چاہتے ہو تاکہ کبھی تمہارے پدرانہ جذبات بے قابو نہ ہو جائیں۔"

"آپ درست کہہ رہی ہیں' میں بچے سے دور رہنا چاہتا تھا تاکہ آپ کو شکایت کا موقع نہ ملے۔"

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"وہ تو ہو چکی ہے۔"

"اس عورت کو بھول جاؤ' وہ کبھی تمہاری زندگی میں نہیں آئے گی۔ اگر کبھی اس نے تمہیں پہچان لیا یا اس گھر کا راستہ دیکھ لیا تو میرے بچے کے لئے مصیبت بن جائے گی۔ میں تمہاری الجھنیں دور کرنا چاہتی ہوں۔ شادی کرو گے' بچے ہوں گے تو تمہارے دماغ کے ہر گوشے سے یہ بات ختم ہو جائے گی کہ تمہارا ایک بچہ تم سے بچھڑ گیا ہے۔ تمہارے آس پاس چند بچے ہوں گے اور وہ تم سے محبت کریں گے' تم بہلتے رہو گے۔"

"باجی جان! میں نے آپ کا کوئی حکم نہیں ٹھکرایا لیکن اس کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔ شادی کی طرف میرا دل مائل نہیں ہوتا۔ میں تنہا زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے لاہور میں رہنے کی اجازت دے دیجئے۔"

"اچھی بات ہے' آجاؤ اور یہاں کا ہوٹل سنبھالو۔"

میں پھر باجی جان کے پاس آ گیا۔ اب میرا بیٹا دن رات میری نگاہوں کے سامنے رہتا تھا۔ میں نے سمجھ لیا تھا' یہ نگاہوں کے سامنے رہے یا نہ رہے۔ ممناز ہر حال میں

یاد آئے گی اور یاد آنے کی وجہ یہ ہے کہ اسے بے یار و مددگار چھوڑنے کے بعد میں نے دوبارہ اس کی خبر نہیں لی تھی۔ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا کہ زچگی کے بعد پھر آنکھیں روشن ہونے کے بعد وہ کیا کر رہی ہے۔ کہاں رہتی ہے وہ بے حد حسین ہے' سیدھی دل میں اتر جاتی ہے۔ تنہا زندگی گزار رہی ہو گی تو جانے کتنے شیطان اس کے تعاقب میں ہوں گے یا اسے برباد کر چکے ہوں گے۔ جب مجھے اس کی بربادی کا خیال آیا تو میں ایک دم سے لرز جاتا تھا۔ جانے کہاں سے غیرت امڈ آتی تھی۔ میں سوچتا تھا' وہ میری عزت ہے کوئی میری عزت پر ہاتھ ڈالے گا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا یا خود شرم سے مر جاؤں گا۔

مجھے کبھی شرم نہیں آئی۔ میں بہن کے گھر میں رہتے رہتے بے حس ہو گیا تھا۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ غیرت کیا ہوتی ہے اور غیرت مند کیسے ہوتے ہیں۔ کس طرح شرم سے چلو بھر پانی میں ڈوب مرتے ہیں لیکن اب کچھ کچھ محسوس ہو رہا تھا۔ ہم تین چیزوں کے مالک ضرور بننا چاہتے ہیں۔ ایک زر' دوسری زمین' تیسری زن۔ مجھے زر حاصل تھا۔ میں اس زر سے زمین بھی خرید چکا تھا اور عورت بھی میرے پاس آئی تھی۔ اگرچہ میں اس سے دور ہو گیا تھا لیکن وہ میری عورت تھی' میری ملکیت تھی۔ میں کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی میری ملکیت کو ہاتھ لگائے۔

تین برس گزر گئے۔ ایک روز باجی جان نے مجھ سے کہا۔ "بخاری صاحب کو فون کرو اور ان سے کہو' میں لندن بات کرنا چاہتی ہوں۔"

بخاری صاحب ٹیلی فون ایکسچینج میں تھے۔ ان کے ذریعے اوورسیز کی کال جلدی مل جاتی تھی اور ایک پیسے کا بل بھی نہیں آتا تھا۔ میرے بہنوئی صاحب ایک معقول رقم اسے ہر ماہ دیا کرتے تھے۔ میں نے بخاری صاحب کا نمبر ڈائل کیا۔ ایکسچینج سے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو' فرمائیے؟"

میں نے کہا۔ "میں بخاری صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

دوسری طرف سے چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی۔ میں نے آواز دی۔

"ہیلو............ ہیلو!"

دوسری طرف جیسے وہ چونک گئی تھی' جلدی سے بولی۔ "ہاں جی' آ............

آپ کون ہیں؟"

"میں' بخاری صاحب کا ایک دوست ہوں۔"

"کیا آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟"

"مجھے ہادی کہتے ہیں' پلیز بخاری صاحب سے بات کرادیں۔"

"مجھے افسوس ہے' وہ آج ڈیوٹی پر نہیں ہیں۔"

میں نے ناگواری سے کہا۔ "یہ بات آپ کو پہلے بتانا چاہئے تھی۔"

وہ جلدی سے بولی۔ "دیکھئے' پلیز ریسیور نہ رکھئے گا۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"میں آپ کو نہیں جانتا اور نہ ہی کسی اجنبی خاتون سے گفتگو کرتا ہوں۔ کیا آپ نے اجنبی لوگوں سے گھنٹوں گفتگو کرنے کے لئے ٹیلی فون ایکسچینج میں ملازمت کی ہے؟"

"آپ ناحق ناراض ہو رہے ہیں۔ میں آپ سے معافی چاہتی ہوں اور آپ سے التجا کرتی ہوں کہ بخاری صاحب سے میری شکایت نہ کریں۔"

"اچھی بات ہے' شکایت نہیں کروں گا۔ اور کوئی بات؟"

"میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔ کیا آپ اوور سیز کال بک کرانا چاہتے ہیں؟"

"نہیں شکریہ!"

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ جب تک وہ ریسیور میرے کان سے لگا ہوا تھا' مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ جانی پہچانی آواز ہے۔ فون پر بولنے والے کی آواز میں تھوڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر میری قوت سماعت غیر معمولی نہیں ہے' میں جن لوگوں سے دن رات ملتا رہتا ہوں ان کی آواز بھی فون پر بڑی مشکل سے پہچانتا ہوں۔

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ "ہیلو۔"

پھر وہی نسوانی آواز سنائی دی۔ "معاف کیجئے گا' میں پھر ڈسٹرب کر رہی ہوں۔ دراصل آپ نے فوراً ہی ریسیور رکھ دیا تھا۔ میں آپ سے کہنا چاہتی تھی' اگر بخاری صاحب سے ضروری گفتگو کرنا ہے تو میں ان کا رہائشی فون نمبر دے سکتی ہوں۔"

"شکریہ' بخاری صاحب کے تمام فون نمبر میرے پاس ہیں۔"

"میں نے آپ کا نام پوچھا اور یہ نامناسب سی بات ہے کہ اپنا نام نہ بتاؤں۔ مجھے مہناز کہتے ہیں۔"

میرے اندر جیسے دھماکا ہوا میں یکبارگی اچھل کر یوں کھڑا ہوا کہ بے اختیار دوسرا ہاتھ ٹیلی فون کے کریڈل پر چلا گیا۔ رابطہ ختم ہو گیا مگر دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ چند لمحے پہلے سوچ رہا تھا' وہ کوئی جانی پہچانی آواز ہے اور آواز والی نے اپنا نام بتا کر میرے اندازے کی تصدیق کر دی تھی۔

میں کریڈل پر ریسیور رکھ کر ٹیلی فون کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ' تین برس کے بعد مہناز کی آواز پھر سنی ہے۔ میں ٹیلی فون کو دیکھ رہا تھا لیکن اس کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ چہرے کا ایک ایک نقش میری نظروں کے سامنے واضح تھا۔ میں پریشان ہو کر ٹہلنے لگا میرا دل اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اس ٹیلی فون ایکسچینج تک پہنچنا بہت آسان تھا لیکن حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ میرے اندر کا مجرم مجھے روک رہا تھا۔ میں محبت سے جاؤں گا لیکن اس سے کیا کہوں گا کہ فون پر بات ہوئی اور میں ابھی اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس طرح تو اسے کچھ کہے سنے بغیر یقین آ جائے گا کہ میں ہی اس کا مجرم شوہر ہوں۔

اب یہ خیال ستا رہا تھا کہ اس نے اپنا نام کیوں بتایا جبکہ میں سراسر ایک اجنبی تھا۔ کیا اتنی دیر تک فون پر گفتگو کرتے رہنے کے دوران اس نے مجھے آواز سے پہچان لیا تھا؟"

ایسا ممکن ہے' پانچ حواسوں میں سے ایک حس ختم ہو جائے تو بقیہ چار حواس میں شدت پیدا ہو جاتی ہے' یہ قدرتی امر ہے۔ جو اندھے ہوتے ہیں' ان کی سننے کی قوت بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ ایک بار جو سنتے ہیں اسے پھر کبھی نہیں بھولتے۔ اس آواز کو ہزاروں لاکھوں میں پہچان لیتے ہیں۔

میں جتنا سوچ رہا تھا' اتنا ہی پریشان ہو رہا تھا۔ کہاں تو محبت کے مارے اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا اور کہاں یہ کہ پہچان لئے جانے کا خوف پیدا ہو گیا تھا۔ میں سوچتے سوچتے یکبارگی چونک پڑا' ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس گھنٹی کی آواز کے ساتھ ساتھ وہ میرے اندر چیخ رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "میں ہوں' میں بول رہی ہوں۔

ریسیور اٹھاؤ‘ میری بات سنو۔“

میں آہستہ آہستہ سہمے ہوئے انداز میں ٹیلی فون کی طرف بڑھ رہا تھا۔ زینے کے اوپری حصے سے باجی جان کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ ”ہادی تم کہاں ہو۔ گھنٹی اتنی دیر سے بج رہی ہے دیکھو کس کا فون ہے۔“

میں نے آہستگی سے ریسیور اٹھایا‘ اسے کان سے لگایا پھر مُردہ سی آواز میں بولا۔ ”ہیلو۔“

ریسیور سے بخاری صاحب کی آواز سنتے ہی جان میں جان آئی۔ وہ پوچھ رہے تھے۔ ”ہادی تم ہو؟“

”جی ہاں‘ میں بول رہا ہوں۔“

”ارے بھئی‘ میری بیٹی نے فون پر بتایا ہے کہ مجھے پوچھ رہے تھے۔“

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ”آپ کی بیٹی نے؟“

”ہاں‘ مہناز میری بیٹی ہے۔ میں نے بڑی بھاگ دوڑ کے بعد اسے اپنے ہی شعبے میں ملازمت دلائی ہے۔ وہ بڑے عزم سے کہتی ہے کہ بہت جلد اپنے باپ کے عہدے تک پہنچ جائے گی۔ بائی داوے کس لئے فون کیا تھا‘ کیا اوور سیز کا معاملہ ہے؟“

”جی ہاں‘ باجی جان لندن بات کرنا چاہتی ہیں۔“

”میں ابھی مہناز سے کہہ دیتا ہوں‘ لائن مل جائے گی۔“

میں نے اطمینان کی گہری سانس لے کر ریسیور رکھ دیا۔ وہ نہیں تھی‘ کوئی اور تھی‘ یہ اور بات ہے کہ وہ بھی مہناز تھی‘ کوئی اور مہناز۔

تھوڑی دیر بعد لندن کی لائن مل گئی۔ میں نے باجی جان کو اطلاع دی‘ وہ اپنے بیڈ روم والے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر بات کرنے لگیں۔ میں ہوٹل چلا آیا۔ میں نے اپنے فور اسٹار ہوٹل میں ایک شاہانہ طرز کا دفتر بنایا تھا۔ وہاں پہنچا تو ملازم نے کہا۔ ”ایک صاحبہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“

”کون ہیں وہ؟“

”وہ اپنا نام مہناز بتا رہی ہیں۔“

میں اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھنے جا رہا تھا‘ ایک دم سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس سے

پوچھا۔ ”کون مہناز؟“

”جناب! میں نہیں جانتا۔ اس نے صرف اپنا نام بتایا ہے۔“

”وہ کہاں ہیں؟“

”ساتھ والے ویٹنگ روم میں ہیں۔“

”اچھی بات ہے‘ اسے دس منٹ کے بعد بھیج دینا۔“

وہ چلا گیا۔ میں دبے قدموں چلتا ہوا اس کھڑکی کے پاس آیا جو ویٹنگ روم میں کھلتی تھی۔ اس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک انگلی سے بڑی آہستگی کے ساتھ پردے کو ذرا سا سرکایا‘ پھر دیکھا اور جو دیکھا وہ میرے ہوش اُڑانے کے لئے کافی تھا وہاں میری مہناز بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے گھبرا کر پردے کو برابر کردیا۔ میرا دماغ چیخ چیخ کر سوال کررہا تھا۔ ”یہ کیا ہوگیا‘ یہ اچانک ہی سیدھی تیر کی طرح میرے پاس کیسے پہنچ گئی ہے؟“

میں حیرت کے سمندر میں ڈوب رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔ آخر یہ کیا ماجرہ ہے‘ وہ مجھے ہادی کے نام سے نہیں جانتی تھی‘ میری کوئی تصویر اس کے پاس نہیں تھی‘ میرا پتا ٹھکانا اسے معلوم نہیں تھا‘ اس کے باوجود وہ اتنی آسانی سے آگئی تھی‘ جیسے شریکِ زندگی دروازے پر دستک دیئے بغیر سیدھی بیڈ روم میں آجاتی ہے چونکہ یہ اس کا حق ہوتا ہے اور آج وہ اپنا حق منوانے چلی آئی تھی۔

میری بزدلی سمجھا رہی تھی‘ یہاں سے بھاگ جا اور عقل سمجھا رہی تھی‘ بھاگ کر کہاں جائے گا جو ہوٹل تک آسکتی ہے‘ وہ گھر تک بھی پہنچ سکتی ہے۔ یہاں سے گھر کا پتا معلوم کرنا اس کے لئے کون سا مشکل ہوگا۔ میں شکست خوردہ انداز میں ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا۔ دس منٹ گزر چکے تھے‘ دروازے پر دستک سنائی دی پھر وہی رس بھری آواز کانوں میں رس گھولنے لگی۔ ”کیا میں اندر آسکتی ہو؟“

میں نے آہستگی سے سر اٹھا کر اسے اجنبی نظروں سے دیکھا‘ پھر کہا۔ ”آؤ‘ آجاؤ۔ یہاں بیٹھو۔“

وہ میز کے دوسری طرف ایک کرسی پر ٹھیک میرے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں پر سیاہ عینک تھی‘ وہ عینک کہہ رہی تھی‘ یہ ضد کی پکی ہے جو وعدہ کیا ہے‘ اسے

نبھا رہی ہے۔ پہلے مجھے ان خوبصورت آنکھوں کو دیکھنے کا موقع دے گی پھر دنیا کو ان کا حسن دکھائے گی۔

وہ دروازے سے چلتی ہوئی کرسی پر آکر بیٹھی تھی۔ میں نے اس کا سراپا دیکھا تھا اور میرے دل نے چیخ چیخ کر کہا تھا' وہ سر سے پاؤں تک میری ہے اور میں بدنصیب ہوں کہ ایسے خوبصورت سراپے سے محروم ہوں۔

اس کی آواز نے چونکا دیا' وہ پوچھ رہی تھی۔ "آپ مجھے ایک ٹک دیکھ رہے ہیں جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔"

"نہیں' میں تمہاری سیاہ عینک کو دیکھ رہا ہوں۔ ایسے شیشوں کی عینک صرف دھوپ میں پہنی جاتی ہے جب کہ یہاں چھاؤں ہے۔ یہ ایئر کنڈیشنڈ کمرا ہے۔ کیا تم صرف آنکھوں کا پردہ کرتی ہو؟"

"آپ درست کہہ رہے ہیں۔ آنکھوں کا پردہ ہو جائے تو سارے جسم کا پردہ ہو جاتا ہے کیونکہ شرم آنکھوں میں ہوتی ہے۔ اکثر ملنے والے سوال کرتے ہیں' میں رات کے وقت یہ عینک کیوں لگاتی ہوں۔ اب میں کیا بتاؤں' تنہائی میں عینک نہیں لگاتی۔ دوسروں کے سامنے اسے آنکھوں پر چڑھا لیتی ہوں یقیناً میری آنکھوں میں کوئی عیب ہو گا یا اس کے پیچھے میری زندگی کے کچھ خوش نصیب اور کچھ بدنصیب لمحات چھپے ہوں گے۔ کیا میں آپ کا پورا نام پوچھ سکتی ہوں؟"

"مجھے ہادی حسین کہتے ہیں۔ ویسے تم کون ہو' میرا نام نہیں جانتی ہو اور ملنے آئی ہو' یہاں آنے کا کوئی مقصد ضرور ہو گا۔"

وہ تھکے ہوئے انداز میں کرسی کی پشت سے ٹک گئی پھر بولی۔ "آپ نے مجھے ابھی تک نہیں پہچانا۔ ہم تھوڑی دیر پہلے فون پر گفتگو کر چکے ہیں۔"

میں کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "اوہ! تم بخاری صاحب کی صاحبزادی ہو؟"

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ میں حیرت اور مسرت کا اظہار کر رہا تھا جیسے اس کی ہاں کا یقین کر رہا ہوں جب کہ وہ میری آنکھوں کے سامنے کھلی کتاب کی طرح تھی۔ اس کے باپ کا نام رحمت علی تھا اور وہ بسم اللہ بستی کا ایک چھوٹا سا زمیندار تھا۔ بخاری اس کا باپ ہو ہی نہیں سکتا تھا لیکن یہ بات میں زبان سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہتا

تو میری اصلیت پکڑی جاتی۔ میں نے کہا۔ "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آج فون پر گفتگو ہوئی اور تم مجھ سے ملنے پہنچ گئیں۔ تمہارے چہرے کی تھکن اور پریشانی بتا رہی ہے' تم کسی مسئلے سے دوچار ہو اور شاید وہ مسئلہ مجھ سے حل کرانا چاہتی ہو۔ تم نے یقیناً اپنے ابو سے میرے اس ہوٹل کا پتا معلوم کیا ہو گا؟"

اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا اور پھر خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے تمہیں کچھ ٹھنڈا یا گرم پینا چاہئے۔"

"میں ٹھنڈی بوتل پینا چاہتی ہوں۔"

وہ ایک ہاتھ پیشانی پر رکھے ہوئے تھی اور اپنی پیشانی کو انگلیوں سے آہستہ آہستہ سہلا رہی تھی۔ میں نے ملازم کو بلایا پھر پوچھا۔ "تم کیا پینا چاہو گی؟"

"جو آپ کو پسند ہو۔"

میں نے ملازم سے بے اختیار کہا۔ "سیون اپ لے آؤ۔"

مہناز نے ایک دم سے چونک کر سر اٹھایا۔ مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ جن دنوں میں اس کے ساتھ ازدواجی زندگی گزار رہا تھا تو کھانے کے بعد ہمیشہ سیون اپ پیا کرتا تھا اور اسے بتایا کرتا تھا کہ اس وقت میں کون سی بوتل پی رہا ہوں اور یہ مجھے بہت پسند ہے۔

ملازم حکم کی تعمیل کے لئے جا رہا تھا۔ میں نے اسے روک کر کہا۔ "ٹھہرو' سیون اپ نہیں کوک لے آؤ۔"

وہ چلا گیا' میں نے کہا۔ مس مہناز! دراصل میں اپنی پسند کے مطابق بوتل منگوا رہا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ بہت کم عورتیں یہ ڈرنک پسند کرتی ہیں۔"

اس نے پوچھا۔ "آپ کو اور کون کون سی چیزیں پسند ہیں؟"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کیا تم میرا انٹرویو لینے آئی ہو؟"

وہ پھر پریشانی کو انگلیوں سے سہلانے لگی۔ پریشان ہو کر بولی۔ "مجھے آپ کی ذاتی زندگی سے متعلق کوئی سوال کرنے کا حق نہیں ہے لیکن یقین کریں' میں اپنی زندگی کے ایک اہم معاملے میں الجھی ہوئی ہوں۔ اس شہر میں میرے بہت کم شناسا ہیں اور جو بھی ہیں وہ کہتے ہیں میں نارمل نہیں ہوں۔ اکثر بہکی بہکی باتیں کرتی ہوں اور پاگلوں جیسی

حرکتیں کرتی ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیسی حرکتیں کرتی ہو کوئی مثال دو؟"

"میرے پاس ڈاک سے آئے ہوئے بہت سے لفافے ہیں جن میں محبت بھرے خطوط ہیں لیکن وہ لفافے دنیا کے کسی ڈاک خانے سے نہیں آئے۔ ان پر نہ بھیجنے والے کا پتا ہے نہ پانے والے کا لیکن میں اس لفافے پر بھیجنے والے شوہر اور پانے والی ممتاز کا نام پڑھ لیتی ہوں۔"

وہ کہہ رہی تھی اور میں شرم محسوس کر رہا تھا اور ضبط کر رہا تھا کہ میرے کسی ردِ عمل سے چوری نہ پکڑی جائے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میں اس میں سے کوئی سا بھی لفافہ کھولتی ہوں اور اس میں سے خط نکالتی ہوں اس میں کوئی تحریر نہیں ہوتی' وہ کورا کاغذ ہوتا ہے' کوئی یقین نہیں کرتا کہ مجھے ایسے خطوط بھیجے گئے ہیں لیکن میں سمجھتی ہوں' میرے بھیجنے والے نے لفافے کے اندر وہ کورا کاغذ کیوں بھیجا ہے' اس لئے بھیجا ہے کہ میں اسے کھول کر دیکھوں تو سارے کاغذ پر میرے محبوب کی تصویر ابھر آئے۔ میں نے اسے کبھی آنکھوں سے نہیں دیکھا لیکن دل سے ایک تصویر بنتی ہے جو اس کورے کاغذ پر ابھر آتی ہے۔"

میں نے میز پر جھک کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا وہ بولی۔ "کیا ہوا' کیا میں آپ کو پریشان کر رہی ہوں؟"

"نہیں' تمہاری باتوں سے پتا چلتا ہے' تمہارے ساتھ کوئی زبردست دھوکا ہوا ہے' تمہارا دل توڑا گیا ہے۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے وہ مجھے کبھی دھوکا نہیں دے سکتے وہ مجھے دل و جان سے چاہتے ہیں۔"

"تو پھر اس سادے لفافے اور کورے کاغذ کا مطلب کیا ہے؟"

"سیدھی سی بات ہے جب وہ مجھ سے بچھڑ کر گئے تھے تو میں اندھی تھی انہیں شاید یقین نہیں تھا کہ مجھے آنکھوں کی روشنی ملے گی' اسی لئے وہ میرا دل رکھنے کی خاطر سادہ لفافے اور کورا کاغذ بھیجتے تھے تاکہ میں انہیں چھو کر دیکھو اور یہ سمجھ لوں کہ یہ میرے محبوب کا محبت نامہ ہے۔ آپ نہیں سمجھیں گے' وہ سادہ لفافے اور کورے

خطوط مجھے کتنا حوصلہ دیتے تھے۔ میں اپنے محبوب کے انتظار میں لمبی سے لمبی عمر جینا چاہتی تھی' آج بھی اسی کے انتظار میں جی رہی ہوں۔ سادے لفافے اور کورے خطوط کی باتیں سن کر آپ بھی مجھے نارمل نہیں سمجھیں گے مگر میں پوچھتی ہوں' اگر میرا محبوب ان کورے کاغذات پر محبت کے دو بول لکھ کر بھیجتا تو فائدہ کیا ہوتا' کیا میں انہیں پڑھ سکتی تھی؟"

میں نے کہا۔ "ابھی شاید تم نے اپنے محبوب کو شوہر بھی کہا ہے' کیا تمہاری اس سے شادی ہو چکی تھی؟"

"جی ہاں' انہوں نے چار ماہ تک میرے ساتھ ازدواجی زندگی گزاری پھر پردیس چلے گئے۔"

"وہ تمہارے جیون ساتھی ہیں' ان کی کوئی تصویر ضرور تمہارے پاس ہو گی؟"

"ہاں' کئی تصویریں ہیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا' ان میں سے میرا شوہر کون ہے؟"

میں نے چونک کر پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

"انہوں نے ایک دن میرے ساتھ کئی تصویریں اتاریں پھر دوسرے دن انہیں پرنٹ کرا کے لے آئے۔ میں تصویریں دیکھ نہیں سکتی تھی انہیں حفاظت سے رکھ لیا اور ان سے کہا جب میری آنکھوں کو روشنی ملے گی تو سب سے پہلے آپ کی تصویریں دیکھوں گی۔"

وہ کہتے کہتے رک گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ آنسو روک رہی ہے۔ سیاہ عینک کے پیچھے سمجھ میں نہیں آتا تھا' اس کی آنکھیں مجھے کس حوالے سے دیکھ رہی ہوں گی۔ وہ بڑے ضبط سے بولی۔ "جب میری آنکھوں کو نور ملا تو میں نے سب سے پہلے تصویروں والا لفافہ کھولا۔ اس میں سے تصویریں نکالیں۔ ایک تصویر سنتوش کمار کی تھی' دوسری درپن' تیسری محمد علی' چوتھی وحید مراد.......... میں حیران تھی' سوچ رہی تھی کیا کوئی نامور فلم اسٹار میرا جیون ساتھی بن کر آیا تھا۔"

وہ کہہ رہی تھی اور اس کی ایک ایک بات مجھے جوتے کی طرح لگ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میرے ساتھ یہ مذاق ہوا ہے یا کوئی مشہور

اداکار میری اندھی آنکھوں سے فائدہ اٹھا کر چلا گیا ہے۔ عقل سمجھاتی تھی ایسی بات نہیں ہے۔ نامور اداکار عارف والا جیسی چھوٹی سی آبادی میں آتا تو شور مچ جاتا۔ وہ دنیا والوں سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ عقل کے سمجھانے کے باوجود میں نے ان تمام نامور اداکاروں کی فلمیں دیکھیں' ان سب کی آواز اور لب و لہجے کو توجہ سے سنا پھر یقین ہو گیا کہ ان میں سے کوئی میری زندگی میں نہیں آیا تھا۔ آج میں نے فون پر آپ کی آواز سنی تو بے اختیار دل دھڑکنے لگا۔ میں آپ سے ملنے کے لئے بے چین ہو گئی' سیدھی یہاں چلی آئی۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔ "کیا میری آواز تمہارے شوہر سے ملتی ہے؟"

"صرف ملتی نہیں' آواز کا ایک ایک اتار چڑھاؤ اور لہجے کی ایک ایک ادا بالکل وہی ہے۔"

میں نے ڈھٹائی سے کہا۔ "کیا بات کرتی ہو! کیا یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں نے تم سے فراڈ کیا ہے۔ میں تمہاری زندگی میں جیون ساتھی بن کر آیا تھا' تمہارے ساتھ کچھ وقت گزارا اور دھوکا دے کر چلا گیا؟"

وہ جلدی سے التجا آمیز لہجے میں بولی۔ "پلیز' آپ برا نہ مانیں' غصہ نہ کریں۔ یوں سمجھ لیں' میں نارمل نہیں ہوں' ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ لیتی ہوں۔ آپ کو خواہ مخواہ پریشان کرنے آگئی ہوں' پلیز! غصہ نہ کریں۔"

وہ ایسا کہتے کہتے رونے لگی۔ پرس سے رومال نکا کر اس سے چہرے کو چھپانے لگی' اپنے آنسو پونچھنے لگی پھر جلدی سے اٹھ کر دور چلی گئی۔ اس کی پشت میری طرف تھی' وہ ایک گوشے میں پہنچ کر سیاہ عینک اتار کر آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ میرے تصور میں وہ آنکھیں روشن ہو گئیں' میں ان آنکھوں کو بار بار' ہزار بار بہت قریب سے دیکھتا رہا تھا' انہیں بے اختیار چومتا رہا تھا۔ آج وہ آنکھیں مجھ سے پردہ کر رہی تھیں۔ وہ مجھے دکھانا نہیں چاہتی تھی' ان آنکھوں کا حسن' ان کا سحر' ان کی گہرائی اور اس گہرائی میں کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی محبت صرف اپنے محبوب کے لئے تھی' وہ اسی کے سامنے سیاہ عینک اتار سکتی تھی۔ اس نے عینک پہن لی پھر میری طرف گھوم کر دیکھا۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اسی کرسی پر آکر بیٹھی۔ اس کے بعد آہستگی سے بولی۔ "مجھے افسوس

ہے' میں شرمندہ ہوں' آپ کے دفتری کاموں میں مداخلت کر رہی ہوں' آپ کو پریشان کر رہی ہوں۔ میں واقعی نارمل نہیں ہوں' یہ کتنی احمقانہ بات ہے کہ شادی میں نے کی' دھوکا میں نے کھایا' سارے دکھ درد میرے ہیں اور میں اس دفتر کو اپنا گھر سمجھ کر رونے بیٹھ گئی ہوں۔ کیا آپ مجھے دھکے دے کر یہاں سے نہیں نکال سکتے؟"

میں تو بہت پہلے ہی دھکا دے کر اسے اپنی زندگی سے نکال چکا تھا لیکن اتنی جرأت نہیں تھی کہ دفتر سے نکال سکتا۔ میرا دل چاہتا تھا' وہ نظروں کے سامنے رہے' اور میں نظارہ کرتا رہوں۔ اس کی ریشمی زلفوں سے' چہرے کی گلابی گلابی ملائمت سے' اس کے لبوں کے کھلتے ہوئے گلاب سے اور اس کی ہر آتی جاتی سانس سے میری گہری رشتے داری تھی۔ میں نے اسے لمحہ لمحہ جانا ہے' اس کے باوجود وہ ایک نئی نئی سی' اجنبی دوشیزہ لگ رہی تھی۔ عورت ایک طویل عرصے کے لئے پردے کے پیچھے چلی جائے پھر اس کی خبر نہ ملے' دیکھو تو دکھائی نہ دے' سنو تو سنائی نہ دے' کچھ دیکھے سنے بغیر غیر محسوس طریقے سے جذبات کی نگرانی میں اپنا بھاؤ بڑھاتی رہے پھر ایک دن اچانک پردے سے نکل آئے تو اسے دیکھ کر آنکھیں حیران رہ جاتی ہیں' اس طویل عرصے میں قدرتی تقاضے' جذباتی تقاضے اور شرارتی تقاضے اس کے حسن و شباب میں نئی تازگی اور نئی دوشیزگی بھر دیتے ہیں۔ شاید اسی لئے بیویاں سال چھ مہینے بعد کچھ عرصے کے لئے میکے جا کر بیٹھ جاتی ہیں۔

وہ آنسوؤں سے بھیگے ہوئے رومال کو پرس میں رکھتے ہوئے بولی۔ "آپ مجھے کوئی ایسی عورت نہیں سمجھیں جو فلرٹ کرتی ہیں اور آپ جیسے دولت مند حضرات کو پھانسنے کے لئے دفتروں اور گھروں میں زبردستی گھس آتی ہیں اور بے تکلف ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ اگر آپ مجھے ایسی عورت نہ سمجھیں تو میں آپ سے شام کو ملنا چاہتی ہوں' اس کے بعد کل صبح ملنا چاہتی ہوں پھر شام کو ملنا چاہتی ہوں پھر پرسوں صبح ملنا چاہتی ہوں۔ میرا دماغ چل گیا ہے۔ میں آپ جیسے اجنبی سے صبح اور شام ملنا چاہتی ہوں' میرا بس چلے تو میں ہر لمحہ' ہر پل آپ کی آواز سنوں اور آپ کی باتیں سنتی رہوں۔"

میں نے کہا۔ "میں سمجھ رہا ہوں' تمہارے شوہر کی آواز سے جو مماثلت ہے' وہ

تمہیں میری طرف لے آئی ہے لیکن ہمارا آئندہ ملنا مناسب نہیں ہے' دنیا والے بدنام کریں گے اور تم اتنا تو جانتی ہو کہ مرد سے زیادہ عورت بدنام ہوتی ہے۔"

"جب میری دنیا لٹ رہی تھی تو کسی نے میری پرواہ نہیں کی' آج میں دنیا کی پروا نہیں کرتی۔ البتہ آپ عزت دار آدمی ہیں۔ آپ کی گھروالی اور دوسرے رشتے دار اس بات پر اعتراض کرسکتے ہیں۔ میں خود ان کے پاس جاؤں گی اور ہاتھ جوڑ کر انہیں یقین دلاؤں گی کہ میں بُری عورت نہیں ہوں مجھے اب تک کی زندگی میں صرف چار ماہ کی خوشیاں ملیں' ان خوشیوں کی صدائیں آپ کی زبان سے سنائی دیتی ہیں' میں یہی سننے کے لئے آپ کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتی ہوں۔ میرا خیال ہے آپ کی گھروالی کو اعتراض نہیں ہوگا۔"

"میں نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ ایسے میں صبح وشام تمہارے ساتھ دیکھا جاؤں گا تو اچھا خاصا اسکینڈل کھڑا ہوجائے گا۔ تم ہر لحہ' ہر پل میری آواز سننا چاہتی ہو۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ایک کیسٹ میں اپنی آواز ریکارڈ کرکے تمہیں دے دوں۔ تم جب چاہو گی اپنے ریکارڈر کو آن کرکے میری آواز سن سکوگی۔"

"میں صرف آواز نہیں سننا چاہتی' آپ کی صورت بھی دیکھنا چاہتی ہوں اور سوچنا چاہتی ہوں' کیا وہ بھی ایسے ہی تھے۔ میں آپ کو چلتے پھرتے دیکھنا چاہتی ہوں اور دل کو سمجھانا چاہتی ہوں' وہ بھی اس طرح چلتے پھرتے ہوں گے۔ جب آپ خاموشی سے بیٹھ کر لکھتے پڑھتے رہیں گے یا مسکراتے رہیں گے تو میں ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھوں گی جسے میں اندھی آنکھوں سے دیکھ نہیں پائی تھی۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں نے چار ماہ تک ان کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے دوران ان کے لمس کو پایا تھا اور ان کی آواز سنی تھی' اس کے بعد جو کچھ دیکھنے کے لئے رہ گیا تھا' وہ میں آپ میں دیکھنا چاہتی ہوں اور اس طرح اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے محبوب شوہر کا خاکہ مکمل کرلینا چاہتی ہوں۔"

میرے دل کا معاملہ عجیب تھا۔ میں تین برس سے یاد کررہا تھا' اسے ایک لمحے کے لئے دیکھنا چاہتا تھا' آج وہ نظر آگئی تو اس کا نظارہ ہی کرتے رہنا چاہتا تھا لیکن وہ خود کہنے لگی کہ میرے ساتھ وقت گزارے گی تو مجھ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ دل کہہ

رہا تھا' اجنبی بن کر ہی سہی' اپنی شریکِ حیات کو سہارا دینا چاہئے۔ نہیں تو یہ بے چاری مجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے مرجائے گی دوسری طرف باجی جان کا خوف تھا' ان کی گھورتی ہوئی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں اور وہ ڈانٹتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"چلو' گھر واپس آؤ۔"

مہناز آسانی سے ٹلنے والی نہیں تھی۔ میں نے وعدہ کیا شام کو ملاقات کروں گا' ملاقات کی جگہ بھی مقرر ہوگئی' اس کے بعد وہ میرا شکریہ ادا کرکے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی مجھے ریسیور اٹھا کر باجی جان سے رابطہ قائم کرنا چاہئے تھا اور انہیں مہناز کے خطرے سے آگاہ کرنا چاہئے تھا لیکن میں چپ چاپ بیٹھا خلا میں تکتا رہا۔ وہ جاچکی تھی' مگر اب تک میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ میں اس کی ایک ایک بات سن رہا تھا۔ ایک ایک ادا دیکھ رہا تھا۔ میرے دل نے سمجھایا اگر میں باجی جان کو مہناز کے بارے میں کچھ بتاؤں گا تو مجھ پر پابندیاں عائد ہوجائیں گی۔ مجھے اس ہوٹل سے ہٹا کر کراچی یا اسلام آباد والے ہوٹل میں ٹرانسفر کردیا جائے گا۔ میں ایک بار پھر مہناز سے طویل عرصے کے لئے جدا ہوجاؤں گا پھر پتا نہیں وہ کب ملے؟

مہناز سے باجی جان کو خطرہ ہوسکتا تھا۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ مجھے پہچان نہیں پائی تھی۔ میری آواز سن کر اسے شبہ ہوا تھا لیکن مجھ سے ملنے کے بعد شاید وہ شبہ دور ہوگیا تھا' اب وہ محض اپنے دل کو بہلانے کے لئے ملنا چاہتی تھی جو کچھ اس نے اندھی آنکھوں سے نہیں دیکھا' وہ مجھ میں دیکھنا چاہتی تھی' میرے لئے اس سے اچھا موقع اور کیا ہوتا کہ وہ مجھے قریب آنے کا موقع دے رہی تھی' میری تین برس سے تڑپتی ہوئی آرزوئیں پوری ہورہی تھیں۔ میں چاہتا تو شوہر بن کر اس کے جسم و جان کا مالک بن کر تمام آرزوئیں پوری کرسکتا تھا لیکن میرے اندر چھپا ہوا مجرم مجھے بزدل بنا رہا تھا اور سمجھا رہا تھا' یہ موقع مناسب ہے۔ میں مہناز کے ساتھ صرف دوست بن کر ایک نئی رومانس بھری زندگی شروع کرسکتا ہوں۔

میں نے غلط کہا کہ شروع کرسکتا ہوں۔ وہ تو میرے کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے ہی شروع ہوچکی تھی۔ میں وقت سے ذرا پہلے عجائب گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ کار ایک جگہ رکی' وہیں اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر دور تک نظریں دوڑانے لگا۔ اس نے ٹھیک پانچ

بجے آنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے زندگی میں کسی لڑکی سے محبت نہیں کی تھی' کبھی کسی کا انتظار نہیں کیا تھا۔ مہناز کو دیکھے بغیر شادی ہوگئی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا' رومانس کیا ہوتا ہے' کسی حسینہ کا انتظار کرتے وقت اس کے بارے میں کیسے کھٹے میٹھے خیالات آتے رہتے ہیں۔ ہماری ازدواجی زندگی نے کیسا عجیب موڑ اختیار کیا تھا کہ وہ دور دور تک بیوی نہیں تھی' صرف محبوبہ ہی محبوبہ تھی۔ اسے چھولینے کو اور پالینے کو دل مچل رہا تھا۔

وہ ٹھیک پانچ بجے عجائب گھر کے احاطے والے گیٹ کے سامنے پہنچ گئی۔ وہاں سے دور دور تک نظریں دوڑانے لگی۔ میں کار سے باہر آگیا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ایک دوسرے کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ قریب آتے ہوئے بولی۔ "میں نے دفتر میں آپ کو خاصا پریشان کیا تھا۔ سوچ رہی تھی' آپ آئیں گے بھی یا نہیں۔"

"دیکھ لو' آگیا ہوں اور تمہیں اپنی آواز بھی سنا رہا ہوں۔"

وہ سنجیدگی سے مسکرانے لگی۔ بے چاری اندر سے زخمی تھی' اس لئے بڑی سنجیدگی سے رسمی طور پر مسکراتی تھی۔ میں نے کہا۔ "یہاں لوگوں کی بھیڑ کم ہوتی ہے۔ عجائب گھر میں کم لوگ آتے ہیں' اسی لئے یہاں ملاقات کر رہا ہوں۔"

"میں اندر نہیں جانا چاہتی تھی۔ میں جیسی عجیب وغریب زندگی گزار رہی ہوں' یہ عجائب گھر اس سے زیادہ عجیب نہیں ہوگا۔ آپ لوگوں کی بھیڑ سے کیوں گھبراتے ہیں' کیا بدنامی کا ڈر ہے؟ میں عورت ہوں' مجھے ڈر ہونا چاہئے۔"

صبح سے یہ دوسری بار وہ میرے سامنے آئی تھی اور جب بھی وہ سامنے ہوتی تھی' اس پر سے نگاہیں ہٹنا نہیں چاہتی تھیں۔ میں نے اجنبی بن کر رہنے کی کوشش کی' اس سے بے نیاز رہنا چاہا' جیسے میرے دفتر آنے والوں کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو۔ وہ آئی ہے بس باتیں کرکے چلی جائے گی لیکن میرے اندر کا شکاری نہیں مانتا تھا' اسے دیکھتا ہی چلا جاتا تھا۔ مرد خواہ کتنا ہی سچا عاشق ہو خواہ کتنا ہی ہمدرد اور پارسا ہو' اس کی آنکھیں قصائی کی طرح سامنے والی کو ضرور ٹٹولتی ہیں۔

وہ عجائب گھر کی چار دیواری میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ کہیں کھلی جگہ چہل قدمی

کرنا چاہتی تھی۔ میں اس کے ساتھ کار تک آیا' وہ اگلی سیٹ پر میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ لاہور خوبصورت باغات کا شہر ہوتا جارہا ہے۔ میں اس کے ساتھ کسی بھی باغ میں چہل قدمی کرسکتا تھا لیکن جھجک رہا تھا۔ ڈر لگتا تھا کہیں باجی جان یا بہنوئی صاحب کے کسی خاص آدمی نے مجھے اس کے ساتھ دیکھ لیا تو طرح طرح کے سوالات کئے جائیں گے۔ وہ کون ہے؟ کیا کرتی ہے؟ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے؟ تم سے کس طرح ملاقات ہوئی؟ تم کس حد تک دلچسپی لے رہے ہو؟ صرف عیاشی یا سنجیدگی؟

میں ان تمام سوالات سے بچنے کے لئے راوی کے کنارے آگیا۔ وہاں بھی اچھی خاصی رونق تھی۔ دریا میں پانی کم تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی پورا چاند چمکنے لگا تھا۔ چاندنی رات میں سیر کا لطف حاصل کرنے کے لئے کچھ بیوی بچوں والے اور کچھ رومانی جوڑے کشتیاں کرائے پر حاصل کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔ "تم بہت دیر سے خاموش ہو کیا بات ہے؟"

"میں کسی اور جہان میں ہوں۔ اپنے محبوب شوہر کے ساتھ دریا کے کنارے کنارے چل رہی ہوں' آپ کو دیکھ رہی ہوں اور سمجھ رہی ہوں' وہ کیسے چلتے ہوں گے اور چلتے چلتے دنیا کو زیادہ دیکھتے ہوں گے یا مجھے؟"

ہم ذرا دور نکل گئے۔ میں نے ایک جگہ گھاس پر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے اس کی صورت نہیں دیکھی لیکن تمہارے ابو نے تو دیکھی ہوگی؟"

"ہاں' وہ انہیں دیکھ لیتے تو پہچان لیتے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پھر تو بڑی اچھی بات ہے۔ اگر تمہارے دل میں ذرا سا بھی شبہ ہے کہ وہ آواز اور لب ولہجے والا میں ہوں تو بخاری صاحب سے پوچھ لو' وہ مجھے کئی بار دیکھ چکے ہیں۔"

"بخاری صاحب میرے ابو نہیں ہیں۔"

میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "پھر؟"

"میں نے جتنے دکھ جھیلے ہیں' ان میں ایک یہ بھی ہے کہ پچھلے برس میرے بابا کا انتقال ہوگیا۔ بخاری صاحب کے بزرگ عارف والا کے رہنے والے ہیں۔ جب وہ جوان تھے اور لاہور اسکول اور کالج کی چھٹیوں میں عارف والا آتے تھے تو میرے بابا

سے ملاقات ہوتی تھی۔ ان کے درمیان اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ بخاری صاحب کی ضد پر ہی بابا نے مجھے دس جماعتوں تک پڑھایا تھا اور بھی آگے پڑھاتے لیکن میں بینائی سے محروم ہوگئی تھی۔ بہرحال میرے پاس بخاری صاحب کا ایڈریس موجود تھا۔ بابا کے انتقال کے بعد میں اس شہر میں ان کے پاس آگئی۔"

وہ کہہ رہی تھی۔ میں دور دریا کی موجوں کو دیکھتا ہوا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "آپ جانتے ہی ہیں' بخاری صاحب بہت زیادہ دولت کمانا چاہتے ہیں۔ خود کو امیر کبیر لوگوں کی صف میں شامل کرنا چاہتے ہیں' اسی لئے رشوت لیتے ہیں۔ آپ جیسے لوگ بھی دل کھول کر رشوت دیتے ہیں۔ بہرحال' میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں محتاج ہوتی' مفلس ہوتی تو شاید وہ مجھے دو وقت کی روٹیاں کھلا کر عارف والا واپس جانے کا مشورہ دیتے' جب انہیں پتا چلا کہ عارف والا کا مکان دو لاکھ میں فروخت ہوسکتا ہے۔ میرا جیون ساتھی جو کچھ کہے سنے بغیر غائب ہوگیا ہے' وہ ہر ماہ دس ہزار روپے بھیجتا رہا ہے تو انہوں نے فوراً ہی اپنے پاس بلالیا۔ مجھے ایک کمرا کرائے پر دیا' وہ میری رہائش اور کھانے پینے کے سلسلے میں ماہانہ ایک ہزار روپے مجھ سے لیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ اچھی بات نہیں ہے' دوست کی بیٹی پر برا وقت آیا ہے تو بیٹی کی طرح ہی اپنے گھر میں تمہیں رکھ سکتے تھے۔"

"کوئی بات نہیں' وہ مجھ سے ماہانہ ہزار روپے لیتے ہیں لیکن وہاں میری عزت تو محفوظ ہے۔ ایک دن بخاری صاحب نے کہا۔ میرے پاس بنک میں جو کچھ ہے وہ آہستہ آہستہ ختم ہوجائے گا۔ مجھے کوئی روزگار حاصل کرنا چاہئے تاکہ مستقل آمدنی کا سلسلہ رہے۔

"میں نے کہا کہ میں کہیں جاب کرنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے کہا۔ میں اپنے شعبے میں ملازمت دلا سکتا ہوں لیکن تم جانتی ہو' یہاں سفارش اور رشوت کے بغیر کام نہیں چلتا اگر تم پچیس ہزار روپے دے سکو تو میں اوپر والوں کو کھلا پلا کر پکی ملازمت دلا سکتا ہوں' میں نے انہیں پچیس ہزار روپے دے دیئے' جس کے نتیجے میں آج ملازمت مل گئی ہے۔ مستقل آمدنی کا ذریعہ پیدا ہوگیا ہے۔"

میں سوچنے لگا۔ انسان اپنا کھیل کھیلتا ہے اور تقدیر اپنا کھیل دکھاتی ہے۔ باجی جان اور بہنوئی صاحب کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے عارف والا پہنچ رہے ہیں' وہاں مکان خرید رہے ہیں۔ وہاں مہناز کو دلہن بنا کر رکھا جارہا ہے۔ اسی عارف والا سے ان بخاری صاحب کا تعلق ہوگا جنہیں وہ رشوتیں دے کر لندن' پیرس اور فرینکفرٹ وغیرہ تک ٹیلی فون پر کئی کئی منٹ تک باتیں کرتے ہیں اور ایک پیسے کا بل نہیں آتا۔ اگر بخاری صاحب سے گہرے مراسم ہوتے یا کسی حوالے سے ہماری فیملی میں ان کا آنا جانا ہوتا تو ہمیں پتا چل جاتا کہ ان کا تعلق عارف والا سے ہے۔ ان سے صرف لین دین کا تعلق تھا' اس لئے ہم انہیں ایک معقول رقم دیتے تھے اور وہ ٹیلی فون کے ذریعے سمندر پار ہمارے پیغامات پہنچا دیا کرتے تھے۔ بہرحال' موجودہ حالات میں یہ ماننا پڑتا ہے کہ ہم لاکھ ذہین ہیں اور بڑے مدبر ہیں ایک سے ایک تدبیر سوچتے ہیں اور عمل کرتے ہیں لیکن آخر کار تقدیر اپنا تماشا دکھا کر رہتی ہے۔

ایک دوسرے کے قریب رہ کر پتا بھی نہ چلا۔ کتنا سارا وقت گزر گیا۔ ہم شام کو پانچ بجے ملے تھے جب راوی کے ساحل سے واپس ہوئے تو نو بج رہے تھے۔ اس نے کہا۔ "رات کے کھانے کا وقت ہوگیا ہے کھانا میرے ساتھ کھانا پسند کریں گے؟"

"میرا اتنا بڑا ہوٹل ہے' پھر تمہارے ساتھ کہیں جاکر کھانے کی کیا ضرورت ہے' تم میرے ساتھ کھاؤ گی۔"

میں اسے اپنے ہوٹل میں لے آیا' اس طرح کھانے پینے میں اس کے ساتھ کچھ اور وقت گزرانے کا موقع مل گیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ اس کا ساتھ چاہتا ہوں لیکن مردانہ رکھ رکھاؤ کے پیش نظر خود کو قابو میں بھی رکھتا ہوں۔

وہ رات کے گیارہ بجے رخصت ہوگئی۔ میرے دل و دماغ پر سرور چھایا ہوا تھا۔ اس کی قربت نے مجھے اور قریب ہونے کا لالچ دیا تھا اور میں سوچ رہا تھا' وہ مرحلہ کب آئے گا اور ایسا مرحلہ جب بھی آئے تو اللہ کرے میرے راز فاش نہ ہوں۔ میں گھر پہنچا تو باجی جان اور بہنوئی صاحب جاگ رہے تھے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے جب انہیں کسی تقریب میں جانا ہوتا ہے تو وہ رات کو جاگتے ہیں' ورنہ دونوں جلد ہی

سو جاتے ہیں۔ آج خلافِ معمول جاگ رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں اتنی رات گئے کیوں آیا ہوں۔ ہوٹل کا کاروبار ایسا ہی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی رات بھر غائب رہتا ہوں۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی باجی جان اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ میرے پاس آگئیں پھر میرے گلے میں بانہیں ڈال کر میرے سینے پر سر رکھ کر روتے ہوئے بولیں۔ "ہماری امی جان اور ابا جان ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے۔"

میں نے سر جھکا کر حیرانی سے باجی جان کو دیکھا جو میرے سینے پر سر رکھے ہوئے تھیں۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ میں نے ان کے سر کو پیار سے سہلاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیسے ممکن ہے! دونوں کا انتقال ایک ساتھ کیسے ہوگیا؟"

تب میرے بہنوئی صاحب نے بتایا۔ انہوں نے دس ہزار کا ڈرافٹ ان کے نام بھیجا تھا' وہ ڈرافٹ لے کر بینک گئے تھے۔ اچانک بنک میں ڈاکا پڑا۔ ڈاکا ڈالنے والوں نے فائرنگ کی جس کی زد میں میرے والدین بھی آگئے تھے۔

کتنی عجیب بات ہے۔ آج کا انسان کیڑے مکوڑوں کی طرح مرجاتا ہے' یہ سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے۔ گیارہ بجنے میں پانچ منٹ پہلے میری امی جان اور ابا جان زندہ تھے۔ بینک میں ڈرافٹ لے کر گئے تھے' صرف ایک منٹ بعد ہی فائرنگ ہوئی فائرنگ کرنے والے جیسے کوئی میونسپل کمیٹی کے آدمی تھے' کتے مارنے آئے تھے اور مار کر چلے گئے تھے۔ میں اپنے والدین کو گالی نہیں دے رہا ہوں۔ گالی تو ان تمام شہیدوں کو پڑ رہی ہے جو کسی غلطی یا جرم کے بغیر آئے دن ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کے ہاتھوں بے موت مرتے جارہے ہیں اور بے موت مرنے کو ہی کتوں کی موت کہا جاتا ہے۔ میں گالی نہیں دے رہا ہوں' جب ہماری باری آئے گی تو ہمیں بھی یہ گالی مفت ملے گی کیونکہ ہمارے ملک کا کوئی بھی شہر اندھی گولیوں سے محفوظ نہیں۔

صبح پانچ بجے والی فلائٹ میں ہماری سیٹیں ریزرو تھیں۔ ہم کراچی پہنچ گئے' مُردہ خانے سے اپنے والدین کی لاشیں حاصل کیں' ان کی تجہیز و تکفین کی آخری رسومات ادا کیں پھر دوسری رات لاہور واپس آگئے۔ باجی جان اور بہنوئی صاحب گھر گئے۔ میں ہوٹل آگیا۔ دفتر میں پہنچتے ہی ملازم کو بلا کر پوچھا۔ "کیا مہناز صاحبہ کا فون آیا تھا یا وہ آئی تھیں؟"

"جی ہاں' آئی تھیں اور آپ کے نام ایک خط لکھ گئی ہیں' وہ آپ کے سامنے موجود ہے۔"

میں نے پیپر ویٹ کو ہٹا کر ایک تہہ کیے ہوئے کاغذ کو کھولا۔ اس میں لکھا تھا۔

"ہادی صاحب! آپ سے ملنے آئی تو پتا چلا' آپ اچانک ہی ضروری کام سے کراچی چلے گئے ہیں۔ عجیب اتفاق ہے' مجھے بھی ایک ضروری کام آپڑا ہے۔ میں بسم اللہ بستی جارہی ہوں۔ وہاں میرے مرحوم والد کی زمینوں کا سودا ہوچکا ہے۔ اس سلسلے میں ضروری کاغذات پر دستخط کرنے ہیں اور رقم وصول کرنی ہے میرا خیال ہے کل صبح تک یا شام کو واپس آجاؤں گی۔ شام کو سات بجے میرا انتظار کیجئے گا میں کسی بھی وقت آؤں گی اور آپ کے ساتھ رات کا کھانا کھاؤں گی' شکریہ!"

اس تحریر کے نیچے مہناز کا نام لکھا ہوا تھا' چلو اچھا ہوا وہ بھی شہر میں نہیں تھی۔ میں تمام دن یہی سوچتا رہا تھا کہ میرے لئے بھٹک رہی ہوگی۔ میں نے دن کے ایک بجے والدین کو سپردِ خاک کرنے کے انتظامات کئے تھے پھر عصر کے وقت قرآن خوانی کرانا تھی لیکن تمام وقت مہناز میرے دماغ میں گردش کرتی رہی تھی۔ میں سچ کہتا ہوں' مجھے ماں باپ کے مرنے کا اتنا افسوس نہیں تھا' جتنا مہناز کو لاہور چھوڑ آنے کا دکھ ہو رہا تھا۔

میرے والدین نے چند روزہ زندگی میں اپنی اوقات کے مطابق کسی کو کچھ دیا تھا اور کسی سے اس کی اوقات سے زیادہ چھین لیا تھا۔ اس کی ایک مثال مہناز تھی۔ اس کی تحریر پڑھنے کے بعد اچانک مجھے ہنسی آگئی۔ میں دفتر میں تنہا تھا' بے اختیار کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ تقدیر بھی کیا تماشا دکھاتی ہے۔ اِدھر مہناز دوبارہ میری زندگی میں آئی اُدھر میرے والدین دوسری دنیا میں پہنچ گئے۔ اب یہ اندیشہ نہیں رہا تھا کہ مہناز سے کبھی میرے والدین کا سامنا ہوگا کیونکہ وہی اسے میری شریکِ حیات کی حیثیت سے جانتے تھے۔ باجی جان اور بہنوئی نے مہناز کو دیکھا تک نہیں تھا اور انہوں نے اپنی مصروفیات کے پیشِ نظر اسے دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی' یعنی اب میں مہناز کے ساتھ آزادی سے کھلے عام گھوم پھر سکتا تھا۔ باجی جان یا بہنوئی صاحب دیکھ لیتے یا ان کے پاس رپورٹ پہنچتی تو میں کہہ دیتا' یہ وہ مہناز نہیں ہے' جو میری زندگی میں شریکِ

حیات بن کر آئی تھی۔ یہ دوسری ہے۔ یا ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ میں کسی موقع پر اسے نام تبدیل کرنے کے لئے کہتا اور وہ راضی ہو جاتی پھر ہر طرح کے خدشات سے نجات مل جاتی۔ وہ محبوبہ کی حیثیت سے ملاقات کرتی رہتی۔ رفتہ رفتہ ملاقاتیں رنگ لاتی رہتیں شاید میں اسے پھر شریکِ حیات کی حیثیت سے قبول کر لیتا۔

تقدیر میرا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ کل تک اپنے مرحوم باپ کی تمام زمینیں بیچ کر اس کی رقم لے کر شہر آنے والی تھی یعنی بسم اللہ بستی اور عارف والا سے اس کا رشتہ کٹنے والا تھا' یہ باتیں میرے حق میں تھیں۔ اُدھر سے کوئی اتنی دور شہر نہ آتا۔ بھلا مہناز سے کون سا سگا رشتہ تھا کہ کوئی اس سے ملنے آتا' نہ ہی کوئی آتا' نہ کوئی مجھے پہچان کر میری پچھلی شادی کا چشم دید گواہ بنتا۔

وقت مجھ پر مہربان تھا۔ میرے حالات بدل رہے تھے اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق مہناز بدلے ہوئے انداز میں پھر میرے قریب آ رہی تھی اور آس پاس یا دور دور تک کوئی اندیشہ نہیں تھا کہ میرا پچھلا جرم پکڑا جائے گا۔ اس رات میں گہری نیند سوتا رہا۔ ہر طرح سے محفوظ ہو جانے کے بعد میں نے طے کر لیا تھا' کل وہ ملے گی تو میں اس کے ساتھ نئے سرے سے ایک رومانی زندگی کا آغاز کر دوں گا۔ اگر وہ اعتراض کرے گی تو صاف صاف کہہ دوں گا' میں مرد ہوں اور ایک حسین اور جوان عورت کی دلجوئی کے لئے فرشتہ بن کر صبح اور شام ساتھ نہیں رہ سکتا۔

میں نے چار ماہ دن رات اس کے ساتھ گزارے ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں' وہ بڑی حیا والی ہے۔ میرے رومانی اور جذباتی مطالبات کو تسلیم نہیں کرے گی لیکن ایسی بھی کیا بات ہے۔ وہ کوئی آسمان سے اتر کر تو نہیں آئی ہے۔ آدمی جب شیطان بننے پر آتا ہے تو ایک نیک اور مستقل مزاج عورت کے پائے استقلال میں بھی لغزش پیدا کر دیتا ہے۔

میں دوسرے لفظوں میں نئے سرے سے اس کا محبوب بن کر اپنی ہی عزت دار بیوی کو بے حیا بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

میں نے دوسری صبح اس کا انتظار کیا۔ وہ نہیں آئی۔ اس کے نہ آنے سے اچانک بے چینی بڑھ گئی' وہ کیوں نہیں آئی؟ اسے آنا چاہئے۔

پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ عارف والا یہاں سے بہت دور ہے۔ ہو سکتا ہے زمین کی خرید و فروخت کے سلسلے میں کوئی رکاوٹ آ گئی ہو' اسے وہاں ٹھہرنا پڑا ہو لہٰذا مجھے صبر سے انتظار کرنا چاہئے۔

لیکن صبر نہیں ہو رہا تھا۔ شام ہو گئی تو جی چاہنے لگا' میں کوئی تیز نشہ استعمال کروں تا کہ اسے بھول جاؤں۔ وہ نہیں آئے گی تو رات کو نیند بھی نہیں آئے گی اور نیند نہیں آئے گی تو مجھے زندگی میں پہلی بار خواب آور گولیاں کھانا پڑیں گی۔

اللہ کا شکر ہے' وہ میری نیند کی دوا بن کر رات کے آٹھ بجے پہنچ گئی' کہنے لگی۔ "سو........... سوری' میں بہت مصروف ہو گئی تھی۔ یہاں سے سینکڑوں میل دور جانے کے باوجود رہ رہ کر آپ کا خیال آ رہا تھا۔ بس یوں سمجھئے' میں بھاگی بھاگی آئی ہوں۔"

میں نے بڑے ہی رومینٹک انداز میں کہا۔ "اور میں تمہارے لئے پریشان ہو رہا تھا' تم تنہا گئی تھیں۔ آخر اتنا لمبا سفر تنہا کیوں کرتی ہو؟"

"میرے نصیب میں تنہائی ہے اور اس تنہائی میں میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔"

"میں نے تمہاری باتوں سے یہ سمجھا ہے کہ جس محبوب شوہر نے تمہیں دھوکے پر دھوکے دیئے' تم ابھی تک اس کا انتظار کر رہی ہو' اسے تم کھلے لفظوں میں فراڈ نہیں کہہ رہی ہو۔"

"کیا میں اپنے سرتاج کو فراڈ کہوں گی تو میری تقدیر بدل جائے گی۔ کیا وہ میری زندگی میں لوٹ آئیں گے؟"

"تقدیر بدلے یا نہ بدلے' جانے والا لوٹ کر آئے یا نہ آئے' سچ کو سچ کہنا چاہئے اور جھوٹ کو جھوٹ۔ وہ جھوٹا تھا' فریبی تھا' اس لئے اپنی تصویر تک تمہارے پاس نہیں چھوڑی۔ تمہارے اندھے ہاتھوں میں فلم اسٹاروں کی تصویریں تھما دیں تھیں ہر پندرہ بیس دن کے بعد ایک سادہ لفافہ بھیجتا تھا' جس کے اندر سادہ کاغذ تہہ کیا ہوا ہوتا تھا اور تم دھوکا کھا جاتی تھیں۔"

"آپ یہ بھی تو سوچیں کہ وہ ہر ماہ دس ہزار روپے کا ڈرافٹ بھیجا کرتا تھا' اگر وہ فراڈ تھا' مجھے لوٹنا چاہتا تھا' برباد کرنا چاہتا تھا' میری عزت سے کھیل کر کہیں گم ہو جانا

چاہتا تھا تو مجھے ہر ماہ دس ہزار روپے کیوں دیتا تھا؟ میری آنکھوں کی بینائی واپس لانے
کے سلسلے میں اس کے ماں باپ نے مجھ پر ہزاروں روپے خرچ کیوں کیئے؟"
میں نے پوچھا۔ "کہاں ہیں اس کے ماں باپ؟"
"یہی معلوم ہوتا تو کیا میں بھٹکتی رہتی؟"
"تمہیں کبھی معلوم نہیں ہو سکے گا۔ تم دھوکا کھاتی رہی تھیں، دھوکا کھاتی رہو
گی۔ اگر ایک شوہر تمہاری زندگی سے غائب ہو جاتا تو یہی سوچا اور سمجھا جاتا کہ ایسا اکثر
ہوتا ہے۔ لوگ ایک حسین اور جوان عورت کو حاصل کرنے کے لئے لمبا فراڈ کرتے
ہیں اور مطلب پورا ہونے کے بعد چلے جاتے ہیں لیکن یہاں تو صرف ایک آدمی کی
بات نہیں ہے۔ تمہارے شوہر کے جانے کے بعد اس کے ماں باپ بھی تمہیں کچھ بتائے
بغیر کہیں چلے گئے۔ آخر یہ سب کچھ ہے کیا؟ پھر بھی تم انہیں فریبی، مکار، ظالم اور
دغاباز نہیں کہو گی؟"

"جب یقین آجائے گا تو ضرور کہوں گی۔ ابھی تو یہ سوچتی ہوں کہ انہوں نے دو
لاکھ کا مکان میرے نام کیا، ہر ماہ دس ہزار روپے بھیجتے رہے، مجھے اس قابل بنایا کہ آج
میں اس دنیا کو دیکھ رہی ہوں.......... ہادی صاحب! اگر یہ فراڈ ہے تو میں نے ایسا
فراڈ کبھی نہیں دیکھا جس کے پیچھے مہربانیاں ہی مہربانیاں چھپی ہوئی ہیں اور اگر یہ
مہربانیاں ہیں تو ایسی مہربانیاں نہیں دیکھیں نہ سنیں، جس کے پیچھے فراڈ ہی فراڈ ہو اور یہ
سمجھ میں نہیں آتا ہو کہ فراڈ کرنے والا شوہر آخر چاہتا کیا تھا اور مہربانیاں کرنے والے
محبوب کا مقصد کیا تھا۔"

اس کی بات گدھے کی لات تھی۔ وہ نادان اور احمق نہیں تھی، لیکن وہ باتوں
باتوں میں گدھے کی طرح لات مارتی تھی اور میں جواباً کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ہم نے
رات کا کھانا ہوٹل پرل کانٹی نینٹل میں کھایا۔ جب رخصتی کا وقت آیا تو میں نے اس
کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کوئی جذباتی بات کہنا چاہتا تھا۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ میں نے
پوچھا۔ "کیا میری آواز اور لب و لہجے کو سننے کا جو عمل جاری ہے، تم اسے یہاں ختم
کر دینا چاہتی ہو؟"

"اگر آپ دست درازی کریں گے تو میں ایک لمحے میں ساری باتیں ختم کر دوں

گی اور ہمیشہ کے لئے اجنبی بن جاؤں گی۔"
"مہناز! یہ کیسی بات ہے تمہیں میری آواز اور لب ولہجہ پسند ہے، تم بڑی لگن
سے میرے سراپا کو دیکھتی ہو، میں کس طرح چلتا ہوں، کس طرح اٹھتا اور بیٹھتا ہوں
تمہاری ایک ایک حرکت سے یہ صاف طور پر عیاں ہے کہ تم مجھے چاہتی ہو۔"
"یہ صاف طور پر عیاں ہے کہ میں آپ میں اپنے محبوب شوہر کی جھلک دیکھ رہی
ہوں اور جھلک دیکھنے کا مطلب وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں، محبوب کا عکس پانی
میں نظر آئے تو میں اس کے گلے میں بانہیں ڈالنے کے لئے پانی میں کود پڑوں اور ڈوب
مروں، پھر سوچنے سمجھنے اور پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ میں نے شوہر کو نہیں
دیکھا تھا، اس کے عکس کو دیکھا تھا۔ میں نے دنیا دیکھی تھی، دین ایمان نہیں دیکھا تھا۔
میں پچھتانے سے پہلے ڈوب مروں گی۔ ایسے میں نہ اللہ ہی ملے گا نہ وصالِ صنم ہو گا۔"
کمبخت بولتی تھی تو بولتی ہی چلی جاتی تھی۔ میں نے سوچا ابھی ابتدا ہے نئی نئی
ملاقات ہے۔ رفتہ رفتہ بے تکلفی بڑھے گی دیکھتا ہوں کہاں بچ کر جائے گی۔ اس نے
رخصت ہوتے وقت پوچھا۔ "آپ کل دس بجے فری ہیں؟"
"ہاں، کیا بات ہے؟"
"میں آپ کے پاس آؤں گی پھر ہم انار کلی جائیں گے مجھے کچھ شاپنگ کرنا ہے۔"
کوئی فلرٹ قسم کی عورت ہوتی تو میں سمجھتا وہ مجھے انار کلی جیسے مہنگے بازار میں
لے جا کر پندرہ بیس ہزار روپے کی شاپنگ کرے گی اور میری جیب سے بل ادا کرائے
گی لیکن وہ ایسی نہیں تھی۔ یہاں ہوٹل پرل کانٹی نینٹل میں اس نے زبردستی اپنے
پرس سے رقم نکال کر بل ادا کیا تھا۔

وہ وعدے کے مطابق صبح دس بجے دفتر پہنچ گئی۔ میں کبھی کبھی گیارہ بجے دفتر پہنچتا
تھا، ورنہ شہزادوں کی طرح پڑا سوتا رہتا تھا، بارہ ایک بجے ہوٹل کے دفتر میں آتا تھا۔
چونکہ اس نے دس بجے کا وقت دیا تھا، اس لئے صبح آٹھ بجے ہی پہنچ گیا تھا، یہ میرے
اندر چھپی ہوئی بے چینی اور دیوانگی تھی جس کا میں کھل کر اعتراف نہیں کر رہا تھا۔
اعتراف نہ کرنے سے فرق کیا پڑتا تھا۔ اندر ہی اندر تبدیلی آرہی ہو، انقلاب برپا ہو رہا
ہو تو آدمی خود اپنے آپ سے نہیں لڑ سکتا اسے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑنا پڑتا

ہے۔

میں اس کے ساتھ انار کلی کے ایک بہت بڑے جنرل اسٹور میں گیا۔ وہ میک اپ کا سامان خریدنے لگی۔ میں نے اس کے لئے دو سوٹ کا کپڑا خریدا۔ جب بل آیا تو اس نے رسید میرے ہاتھوں سے چھین لی' خود اپنی طرف سے بل ادا کیا۔ میں نے کہا۔ "یہ کیا' یہ تو میں اپنی مرضی سے لے رہا ہوں۔ بل مجھے ادا کرنا چاہئے۔"

"جی نہیں' میں نے انار کلی آکر شاپنگ کرنے کی بات کہی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ مجھے شاپنگ کرائیں گے۔"

میں نے اتنی بڑی دکان میں خریداروں کے بیچ اس سے بحث نہیں کی۔ ہم کار میں آکر بیٹھ گئے' میں نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے اپنے والد مرحوم کی زمینوں سے کافی رقم ملی ہے۔"

"پتا نہیں میں نے گھاٹے کا سودا کیا ہے یا منافع کا۔ میں تنہا ہوں۔ جیسا لوگ سمجھاتے ہیں سمجھ لیتی ہوں۔ مختصر یہ کہ میں نے نو لاکھ بیس ہزار روپے میں تمام زمینیں فروخت کر دی ہیں۔"

"اب اس رقم سے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"کچھ نہیں' میں کاروبار کی اے بی سی سے واقف نہیں ہوں اور نہ ہی کسی کے بھروسے پر اتنی بڑی رقم پھنسانا چاہتی ہوں۔ سوچتی ہوں ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ خرید لوں پھر دس برس کے بعد یہ سرٹیفکیٹ کیش کرا لوں گی۔"

"دس برس تک نو لاکھ روپے ایک جگہ پر رکھنا دانش مندی نہیں ہے۔ رقم گردش کرتی رہے تو بڑھتی رہتی ہے۔"

"مجھے گردش میں چھوڑنے والا موجود ہوتا تو یہ ساری رقم اس کے ہاتھوں میں رکھ دیتی۔ کسی دوسرے کے ہاتھ میں دوں گی تو منافع کی ضمانت مانگوں گی۔ ایک اپنا گھر والا ایسا ہوتا ہے جس سے عورت ضمانت نہیں مانگتی۔ جب وہ جسم و جا[illegible] ہوتا ہے تو پھر اس کی زندگی کے ہر معاملے میں سیاہ و سفید کا مالک بن جاتا ہے۔"

میں اپنے مطلب کی بات کہنے کے لئے ذرا جذباتی ہو گیا۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "تمہیں کسی کو ایک دن مالک بنانا ہو گا کب تک تنہا رہو گی۔ جو تمہاری زندگی

سے جا چکا ہے' وہ شاید کبھی نہ آئے۔"

اس نے سر گھما کر مجھے دیکھا۔ میں کار اسٹارٹ کرنے کے بہانے نظریں چرانے لگا حالانکہ ہماری نظریں کبھی نہیں ملتی تھیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سیاہ عینک کے پیچھے اس کے دیکھنے کا انداز کیسا ہے لیکن یہ جھوٹے کی پہچان ہے' کوئی دیکھے یا نہ دیکھے' وہ غیر شعوری طور پر آپ ہی نظریں چراتا ہے۔

میں نے کار اسٹارٹ کر کے گاڑی آگے بڑھا دی' وہ بولی۔ "میں ایک بار آگ سے جلنے کے بعد دوسری بار جلنے کی حماقت نہیں کروں گی۔"

"لیکن ہمارا یہ ساتھ کیا معنی رکھتا ہے؟"

وہ جواب نہ دے سکی۔ سر جھکا کر سوچ میں پڑ گئی۔ میں نے کہا۔ "تم نادان بچی نہیں ہو۔ میرے ساتھ صبح و شام گھومنے پھرنے کا ارادہ کیا تھا تو یہ بھی سوچا ہو گا کہ میں مرد ہوں' تمہاری آرزو کر سکتا ہوں بلکہ کر رہا ہوں۔ یہ فطری تقاضا ہے' تم میری آرزو' میری طلب سے انکار نہیں کر سکتیں۔ انکار کرو گی تو ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے' ہم پھر ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن جائیں گے اور کبھی ایک دوسرے کے سامنے نہیں آئیں گے۔"

وہ بدستور سر جھکائے ہوئے بولی۔ "آپ کوئی دوسری بات کریں۔"

"کیا بات بدلنے سے حقیقت بدل جائے گی؟ یہ روز روز کی ملاقات ضرور رنگ لائے گی۔ تم فیصلہ سنا دو ہم کس رنگ میں رنگنے والے ہیں؟"

وہ پھر چپ رہی۔ اپنے اندر کی کش مکش کو چھپانے کے لئے دوپٹے کے آنچل سے کھیلنے لگی۔ میں نے بخاری صاحب کے مکان کے سامنے گاڑی روک دی۔ وہ دروازہ کھول کر اترنے لگی۔ میں نے کہا۔ "تم نے ابھی ٹال دیا۔ مجھے خوشی ہو گی' جب تم شام کو میری آرزو کے مطابق جواب دو گی۔"

وہ دروازہ بند کر کے جانے لگی۔ میں بڑی لگن سے اس کی چال کو دیکھتا رہا۔ اس کا ہر قدم میرے دل پر پڑ رہا تھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے گاڑی اسٹارٹ کی پھر گھر آ گیا۔ ڈرائنگ روم میں میرا بیٹا کھیل رہا تھا۔ میں جب بھی مہناز سے رخصت ہو کر آتا اور بیٹے کو دیکھتا تو شدت سے اپنے جرم کا احساس ہوتا تھا۔ میں کہاں

تھا' بیٹا کہاں پڑا ہوا تھا اور ماں کہاں بھٹک رہی تھی۔ میں سمجھتا تھا' ساری زندگی باجی جان کی خدمت کرتا رہوں گا' بہنوئی صاحب کی کمائی پر ہاتھ صاف کرتا رہوں گا' محنت کئے بغیر دولت مند بنتا رہوں گا' تو زندگی عیش و آرام سے گزر جائے گی۔ اب پتا چل رہا تھا زندگی میں صرف دولت نہیں' محبت کے جذبات اور خون کے رشتے بھی اہم ہوتے ہیں۔

یہ میری عادت ہے' میں تھوڑی دیر کے لئے جذباتی ہوتا ہوں پھر اپنے آپ کو سمجھاتا ہوں کہ میں نے کوئی بڑا جرم نہیں کیا ہے۔ چھوٹی موٹی غلطی سبھی سے ہوتی ہے اور جو غلطی ہوتی ہے' اس پر پچھتانا نہیں چاہئے بلکہ تلافی کرنا چاہئے۔ اگر میں مہناز کے ساتھ ازدواجی زندگی گزاروں تو پھر باپ بن جاؤں گا۔ اولاد سے محرومی کا احساس نہیں ہوگا۔ بچھڑی ہوئی شریکِ حیات بھی ساتھ رہا کرے گی۔ جب ہم خوشحال رہا کریں گے' ہمارا مستقبل شاندار ہوگا' ہمارے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں گے' کامیاب بزنس مین بنیں گے تو مہناز کے ساتھ ہونے والی ایک ایک زیادتی کی تلافی ہو جائے گی۔

میں نے دوپہر کا کھانا باجی جان کے ساتھ کھایا پھر ہوٹل میں آگیا۔ شام کے سات بجے مہناز نے فون کیا۔ میں نے پوچھا۔ "تم کہاں ہو؟ کیا یہاں نہیں آؤ گی؟"

"میں آگئی ہوں' کمرا نمبر سات سو سات میں ہوں۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا تم میرے ہوٹل کے کمرے میں ہو؟"

"ہاں' آپ آرہے ہیں نا؟"

"آرہا ہوں' مگر یہ تمہاری آواز بھرائی ہوئی کیوں ہے؟"

"کچھ نہیں' نزلہ ہوگیا ہے۔"

"میں آرہا ہوں۔"

میں نے ریسیور رکھا' فوراً ہی اٹھ کر لفٹ کے ذریعے ساتویں فلور میں پہنچ گیا۔ کمرا نمبر سات سو سات کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے مہناز کی آواز آئی۔ "آجایئے۔"

میں دروازہ کھول کر اندر آیا پھر اسے بند کیا' پلٹ کر کے میں دیکھا تو وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں........ آنسوؤں سے دھلی ہوئی

صاف و شفاف آنکھیں بہت ہی خوبصورت لگ رہی تھیں۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ آنکھوں کو کبھی روشنی ملے گی تو وہ آنکھیں سب سے پہلے اپنے محبوب کو دکھائے گی اور جب تک نہیں دکھائے گی' ان آنکھوں کو سیاہ عینک میں چھپائے رکھے گی لیکن آج اس نے وہ عینک اتار دی تھی۔

مجھے پوچھنا چاہئے تھا' وہ سیاہ عینک کیوں اتر گئی لیکن اس سے زیادہ یہ سوال ضروری تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ اس نے کہا۔ "میں اپنی ذلت پر رو رہی ہوں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیسی ذلت؟"

"یہی کہ میں پیار کے قابل نہیں ہوں۔ اگر ہوتی تو مجھ سے پیار جتانے والا دنیا کی ٹھوکروں میں چھوڑ کر نہ جاتا۔ آپ انصاف سے بتائیں' کیا میں حسین نہیں ہوں' کیا میں جوان نہیں ہوں؟"

میں نے کہا۔ "شاعر حسن کو چاند جوانی کو کنول سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن میں کہتا ہوں' چاند تمہارا حسن چراتا ہے اور کنول تمہاری جوانی کی بھیک مانگتا ہے۔"

کہنے کو تو میں روانی سے کہہ گیا پھر ایک دم سے گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ سہاگ رات کو اس کے حسن و شباب کی تعریف کرتے ہوئے میں نے بالکل یہی بات کہی تھی۔ وہ مجھے گہری چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے پتھر ہوگئی تھی اور اب مجھے پتھر کی طرح لگنے والی تھی۔

وہ سرد لہجے میں بولی۔ "دو دن پہلے ٹیلی فون پر آواز سنتے ہی میں سمجھ گئی تھی کہ میں نے اپنی اندھیری دنیا میں اندھیر مچانے والے کو پھر سے پالیا ہے۔"

"یہ........ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہی جو آپ کرتے آئے ہیں۔ آپ سمجھتے تھے میری اندھیری دنیا میں ہکلا کر بولتے رہیں گے تو اپنی روشن دنیا میں آپ کو نہیں پہچان سکوں گی۔ بے شک میں آپ کو نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن آپ کی عادتوں کو پہچان تو سکتی تھی۔ آپ سگریٹ نہیں پیتے تھے' پان نہیں کھاتے تھے' آپ کھانے کے بعد چائے ضرور پیتے تھے اور چائے پینے کے بعد صرف چھالیہ منہ میں رکھتے ہیں' آپ سیون اپ شوق سے پیتے ہیں۔ کوئی اور ڈرنک آپ کو پسند نہیں ہے۔"

میں نے ڈھٹائی سے کہا۔ "تم بکواس کررہی ہو۔ کیا مجھے یہ الزام دینا چاہتی ہو کہ میں تمہارا شوہر ہوں اور میں نے تمہاری اندھیری دنیا میں آکر تمہیں فریب دیا تھا؟"

اس نے پھر گہری اور چبھتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا۔ اس کے بعد بولی۔ "کیا آپ میرے ساتھ عارف والا چلیں گے؟"

میں نے ناگواری سے کہا۔ "مجھے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں جانتی تھی' آپ انکار کریں گے۔ اسی لئے تنہا عارف والا گئی تھی۔ میں نے اپنی زمینیں ایک برس پہلے ہی فروخت کردی تھیں۔ وہاں میرے کچھ ہمدرد ہیں۔ عارف والا کے کونسلر' اسکول کے ہیڈ ماسٹر' میونسپل کے چیئرمین اور وہاں کے پٹواری صاحب سبھی نے آپ کو وہاں چار ماہ تک دیکھا ہے۔ میں ان کے پاس گئی تھی۔ انہیں اپنی مجبوریاں بتائیں کہ آپ کو وہاں لے جاکر شناخت نہیں کراسکتی کیونکہ آپ بہت بڑے آدمی ہیں پھر یہ کہ آپ میرے شوہر غلام حسین ثابت نہ ہوئے تو مجھے آپ کے سامنے بڑی شرمندگی ہوگی۔ لہٰذا میں چپ چاپ تصدیق کرنا چاہتی تھی۔ آپ کی تصویر بھی حاصل نہ کرسکی۔ جب ان کو یہ باتیں بتائیں تو اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب میرے ساتھ لاہور آنے پر راضی ہوگئے۔ انہوں نے کہا میں دیکھ کر پہچان لوں گا۔ اگر یہ وہی شخص ہوگا جس نے تمہارے ساتھ شادی کی تھی تو میں یہاں آکر کونسلر صاحب اور پٹواری صاحب وغیرہ کو آکر بتاؤں گا پھر اس کے خلاف قانونی کارروائی کرنے کے سلسلے میں اقدامات کئے جائیں گے۔"

اس کی باتیں سن کر میرے ہوش اُڑ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ شکنجے میں آرہا ہوں یا شاید آچکا ہوں' وہ کہہ رہی تھی۔ "میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب سے التجا کی کہ وہ آپ کے سامنے نہ آئیں' دور ہی دور رہ کر پہچان لیں پھر میں ان سے بعد میں ملاقات کروں گی لہٰذا انہوں نے آج صبح انارکلی میں آپ کو دیکھا اور پہچان لیا۔"

ایسے کہتے وقت وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ "جب انہوں نے تصدیق کردی تو میں کیا بیان کروں' مجھے کس طرح اپنی ذلت کا احساس ہوا۔ کیا میں کوئی بازاری عورت ہوں جس سے آپ چار ماہ تک کھیلتے رہے۔ اس کا بھاری معاوضہ دیا کیونکہ آپ رئیسِ اعظم ہیں۔ کیا اب بھی آپ انکار کریں گے کہ مجھ اندھی

کے پاس شوہر نہیں' گاہک بن کر آئے تھے؟"

غبارے سے ہوا نکلتی ہے میرے اندر سے خوش فہمی کا غبار نکل گیا۔ میں شکست خوردہ انداز میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بولی۔ "ہیڈ ماسٹر صاحب وہاں سے کچھ معززافراد کو یہاں لانا چاہتے تھے لیکن میں نے منع کردیا۔ میں نے پوچھا' آپ لوگ کیا کریں گے' زیادہ سے زیادہ قانونی کارروائی کریں گے' عدالت سے میرے حقوق دلائیں گے۔ میرا کیا بھلا ہوگا۔ عدالت میرے حقوق تو دلا سکتی ہے' میرے شوہر کی محبت تو نہیں دلا سکتی۔ اس نے پہلے بھی مجھ سے عداوت کی آج بھی سامنے رہ کر عداوت کررہا ہے۔ کیا عدالت کا فیصلہ اس کے دل سے یہ عداوت نکال سکتا ہے' اگر ایسا نہیں ہوسکتا تو میں ایسے شخص کو عدالت سے لے کر کیا کروں جو صرف نام کا شوہر ہوگا۔ مجبوراً شوہر کے فرائض ادا کرے گا لیکن محبت سے نہیں کرے گا۔ وہ عورتیں اور ہیں جو محبت کے بغیر جی لیتی ہیں۔ میں ایک پل بھی ایسے شخص کے ساتھ نہیں رہ سکتی جو مجھے ذلیل' کمتر اور بکاؤ مال سمجھتا ہے۔"

میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "تم کبھی یقین نہیں کروگی لیکن اللہ جانتا ہے' میں نے تم سے فراڈ کرنے کے باوجود دل وجان سے محبت کی ہے۔ میں تمہیں چھوڑ کر آنے کے بعد کبھی سکون سے نہیں رہا۔ تم نے ان دو دنوں میں خود محسوس کیا ہوگا۔ سمجھا ہوگا کہ میں تمہیں دل سے چاہتا ہوں لیکن اپنے جرم کو بھی چھپاتا آرہا ہوں' اس لئے کہ میں شرمندہ ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ ہر ماہ دس ہزار روپے بھیجتا رہوں گا' تمہاری آنکھوں کی روشنی دلاؤں گا تو میری غلطیوں کی تلافی ہوجائے گی۔"

"یہ تم نے بازاری انداز میں سوچا۔ تلافی کرنا چاہتے تو رقم نہ دیتے' محبت دیتے۔ چھوڑ کر چلے گئے تھے اور پچھتا رہے تھے تو محبت سے واپس آتے' تم نہیں آئے۔ میں پھر تمہاری زندگی میں آگئی۔ اب بھی تم نے وہی فریب کیا۔ ایک شوہر بن کر مجھے طلب نہیں کیا۔ تم شریکِ حیات کی توہین کررہے ہو۔ کیا سمجھتے ہو محبوب بن کر' ایک نئے عاشق بن کر طلب کروگے تو مجھے خوشی ہوگی؟"

"میں سچ کہتا ہوں' اپنی پچھلی غلطیوں پر اس قدر شرمندہ ہوں کہ ایک شوہر کی حیثیت سے تمہارے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔"

"آپ جسے غلطی کہہ رہے ہیں وہ بہت بڑا جرم ہے۔ آپ نے جرم کیوں کیا؟ مجھ سے شادی کی' مجھ سے ازدواجی رشتہ قائم کیا اور اس وقت تک ساتھ رہے' جب تک میں نے ماں بننے کی خوشخبری نہیں سنائی' اِدھر میں نے خوشخبری سنائی' اُدھر آپ نے پردیس جانے کی بری خبر سنا دی اور چلے گئے۔ میں معلوم کرنا چاہوں گی' آپ نے یہ جرم کیوں کیا' آخر یہ کیا ڈراما تھا' اس ڈرامے کے پیچھے آپ کا مقصد کیا تھا؟"

میں نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ "ایک بار میرا بسم اللہ بستی سے گزر ہوا تھا۔ وہاں میں نے تمہیں دیکھا تھا اور اسی وقت ارادہ کیا تھا کہ تمہیں حاصل کرنے کا۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بیوی بچوں کے جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا' اس لئے دولت کے بل بوتے پر یہ ڈراما کیا تھا۔"

"آپ مجھ سے کب تک جھوٹ بولتے رہیں گے۔ اسی لئے تو کہتی ہوں کیا عدالت کا فیصلہ آپ کی زبان سے وہ جھوٹ دھو سکتا ہے جو آپ مجھ سے بولتے رہے ہیں اور آئندہ بھی بولتے رہیں گے۔"

"تم ایک بار مجھ سے دھوکا کھا چکی ہو' اس لئے مجھ پر بھروسا نہیں کر رہی ہو۔"

"آپ باتیں بنائیں گے مگر سچ نہیں بولیں گے۔ چلئے اس بات کا جواب دیجئے۔ آپ مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو آپ کے والدین میرے پاس کیوں رہ گئے۔ وہ بھی چلے جاتے۔ آپ کی ہوس تو پوری ہو چکی تھی پھر وہ میرے بچے کی ولادت تک میرے پاس کیوں رہے؟"

میرا سر گھوم رہا تھا۔ دماغ میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ میں اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے پورے ہوش و حواس میں رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ "بے شک میں نے تمہیں چھوڑ دیا تھا لیکن ہمارے دل میں اللہ کا خوف ہے' ہم نہیں چاہتے تھے تم زچگی کے وقت بے یار و مددگار رہو۔ تمہارے بوڑھے بابا تنہا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ تمہیں محلے کی عورتوں کا محتاج رہنا پڑتا۔ اس لئے میرے ماں باپ نے تمہاری زچگی ہونے اور آنکھوں کی روشنی ملنے تک ساتھ دیا پھر آنکھوں کی پٹی کھلنے سے پہلے چلے آئے۔"

"یعنی آپ کے دل میں اور آپ کے ماں باپ کے دل میں اللہ کا خوف ہے۔

آپ نے پہلے مجھ سے برائی کی پھر اللہ کے خوف سے نیکی کمائی۔ وہ کیسے ماں باپ ہیں' کیسے بزرگ ہیں جو آپ کی برائی میں شریک رہے! میں ان سے ضرور ملنا چاہوں گی۔"

"وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔"

"وہ نہیں رہے پھر میرے بچے کو کہاں چھوڑ گئے ہیں؟"

میں نے ایک دم سے چونک کر سر اٹھایا' اسے دیکھا' نظریں ملتے ہی پھر آنکھیں جھک گئیں۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔ "کس بچے کی بات کر رہی ہو؟"

"میں اپنے بچے کا پوچھ رہی ہوں۔"

"کیا اماں جان نے تمہیں نہیں بتایا کہ وہ پیدا ہوتے ہی مر گیا تھا؟"

"مریں گے اس کے دشمن۔ میں پہلی اور آخری بار سمجھا رہی ہوں' میرے بچے کے بارے میں جھوٹ نہ کہنا۔ بیوی اپنے شوہر کا جھوٹ اس لئے برداشت کر لیتی ہے کہ وہ اس کے بچے کا باپ ہوتا ہے اور باپ ہو کر وہ بچے کو جیتے جی مُردہ کہے گا تو ماں کا کلیجا پھٹ جائے گا۔ میں اپنے قاتل کو برداشت کر لوں گی لیکن بچے کے قاتل کو برداشت نہیں کروں گی۔"

"تم جانتی ہو' زچگی کے وقت میں نہیں تھا۔ مجھے جو بتایا گیا وہی کہہ رہا ہوں۔ اگر تم کہتی ہو' ہمارا بچہ زندہ ہے تو میرے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"آپ مجھ سے کب تک جھوٹ بولتے رہیں گے' کب تک فریب دیتے رہیں گے۔ یہ یقین ہو رہا ہے کہ آپ کو میری ذات سے دلچسپی نہیں ہے۔ میرے دکھ کا کوئی احساس نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں' بچہ آپ کے پاس ہے اور میں آخری بار سمجھا رہی ہوں' اگر وہ صبح ہونے سے پہلے میرے پاس نہ آیا تو میں کسی بہت بڑے وکیل کی خدمات حاصل کروں گی اور قانونی کارروائی شروع کر دوں گی۔"

"مہناز! غصے میں آ کر کوئی غلط قدم اٹھاؤ گی تو بعد میں پچھتاؤ گی تمہیں کسی نے میرے خلاف بھڑکایا ہے اور جس نے بھی بھڑکایا ہے جا کر اس سے پوچھو کہ وہ بچہ میرے پاس ہے تو کہاں ہے؟"

وہ تھوڑی دیر تک مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "تمہاری

بہن کے بیٹے کی عمر کیا ہے؟"
میں ذرا چونکا پھر سنبھل کر بولا۔ "وہ کوئی دو برس کا ہے۔"
"اس کی تاریخ پیدائش کیا ہے؟"
"کیسی باتیں کرتی ہو۔ کیا میں بہن کے بچے کی تاریخ پیدائش یاد رکھتا پھروں گا؟"
اس نے اپنا پرس کھولا' اس میں سے ایک دعوتی کارڈ نکالا پھر اسے میری طرف پھینکتے ہوئے بولی۔ "یہ سالگرہ کا دعوت نامہ بخاری صاحب کے پاس آیا تھا۔ آج سے گیارہ ماہ پہلے تمہاری بہن کے بیٹے کی سالگرہ منائی گئی تھی۔ ذرا دیکھو' اس میں تاریخ پیدائش کیا لکھی ہے؟"
میں نے کارڈ دیکھا پھر کہا۔ "سات اکتوبر۔"
اس نے کہا۔ "یہ پرانا کارڈ بخاری صاحب کا ایک بچہ ہاتھ میں لئے کھیل رہا تھا۔ کارڈ بہت ہی خوبصورت اور مہنگا ہے میں نے اس پر ایک نظر ڈالی اور جب تاریخ پیدائش پڑھی تو ممتا کا زخم ہرا ہوگیا۔ کیونکہ سات اکتوبر کو میں نے بھی ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ میں آپ کو پھر موقع دے رہی ہوں۔ کیا آپ سچ بولنا چاہیں گے؟"
میں بری طرح پھنس گیا تھا پھر بھی آخری بار بات بنانے کی کوشش کی۔ اس سے کہا۔ "یہ محض اتفاق ہے' جس دن تمہاری زچگی ہوئی' اسی دن باجی جان کے ہاں بھی بیٹا پیدا ہوا۔"
وہ بولی۔ "تمہارے والدین زندہ تھے۔ اگر بیٹی اور بہو کی زچگی ایک ہی دن ہو تو ماں کس کے پاس رہے گی۔ کیا اس بہو کے پاس جسے بیٹا ٹھکرا کر چلا گیا ہے اور جسے وہ بھی ٹھکرا کر جانے والے تھے پھر وہ اس بہو کے پاس کیوں تھے' بیٹی کے پاس کیوں نہیں گئے؟"
"باجی جان کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔ وہ ایک مہنگے میٹرنٹی ہوم میں تھیں' اس کے برعکس تم تنہا اور بے سہارا تھیں۔ ہمارے دل میں اللہ کا خوف ہے' ہم تمہیں یونہی چھوڑ نہیں سکتے تھے۔"
"یعنی آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں ایک وکیل کی خدمات حاصل کروں اور اس کے ذریعے عدالت سے آپ کی بہن اور بہنوئی کے طبی معائنے کا اجازت نامہ

حاصل کروں۔ ابھی رات ہے' صبح تک سوچنے کا وقت ہے' اچھی طرح سوچئے۔ اگر طبی معائنے سے یہ ثابت ہوگیا کہ تمہاری بہن یا بہنوئی میں سے کوئی ایک بانجھ ہے یا دونوں ہی بانجھ ہیں تب کیا ہوگا؟"
یہ مہناز کا آخری حملہ تھا' اب ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ بہنوئی صاحب کے خاندان میں اور ہماری سوسائٹی میں سبھی معزز افراد جانتے تھے کہ بیٹا کنور آفتاب احمد کا ہے اور میری باجی جان اس بچے کی ماں ہیں۔ اگر مہناز عدالت تک پہنچے گی تو بات بچے سے شروع نہیں ہوگی' میرے فراڈ سے شروع ہوگی کہ میں نے ایک اندھی سے شادی کیوں کی؟ اسے چھوڑ کر کیوں چلا گیا؟ جب ہم بے انتہا دولت مند ہیں تو بہت ہی خفیہ طریقے سے مری کے ایک کاٹیج میں مہناز کو زچگی کے لئے کیوں لے جایا گیا۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد مر گیا تھا۔ یہ فراڈ کھلنے والا تھا کہ میں نے اپنی بہن کی گود میں بچہ دینے کے لئے مہناز کو فریب دیا۔
پھر جب یہ راز کھلے گا کہ باجی جان یا بہنوئی صاحب میں سے کوئی بانجھ ہے تو پھر سوال پیدا ہوگا' وہ بچہ کہاں سے آیا اور اسی تاریخ کو کیسے آیا جس تاریخ کو مہناز نے ایک بچے کو جنم دیا تھا۔
میں نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا پھر کہا۔ "تم جیت گئیں' جھوٹ ہار گیا۔ میری ذات سے تمہیں جتنی تکلیفیں پہنچی ہیں' میں اس کی سزا پانے کو تیار ہوں لیکن ایک التجا کرتا ہوں' خدا کے لئے عدالت تک نہ جاؤ' کوئی ایسا قدم نہ اٹھاؤ' جس سے میری باجی جان کا دل ٹوٹ جائے۔ وہ بچہ ان کی جان بن گیا ہے۔"
"بچہ صرف اپنی ماں کی جان ہوتا ہے۔ کیا آپ کو میرے دل کے ٹوٹنے کا احساس نہیں ہے۔ میں سیدھی اور صاف بات کہتی ہوں' مجھ سے کسی قسم کی التجا نہ کریں' کوئی بات بنانے کی کوشش نہ کریں۔ میرا صرف ایک ہی مطالبہ ہے اور وہ ہے میرا بچہ۔ مجھے وہ مل جائے گا تو میں بھول جاؤں گی کہ آپ نے مجھ پر کیا کیا ستم ڈھائے ہیں۔"
"ہم آج بھی میاں بیوی ہیں' ہم پیار و محبت سے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ ہمیں اور بھی بچے دے گا۔"
وہ سرد لہجے میں بولی۔ "مجھے میرا بچہ چاہئے۔ میں کہہ چکی ہوں باتیں بنانے کی

کوشش نہ کریں۔"

"پلیز، میری مجبوری سمجھو، میں وہ بچہ تمہیں کیسے دے سکتا ہوں؟"

"ایسے ہی دے سکتے ہیں جیسے میرے پاس سے پہلے جاکر بہن کو دیا تھا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کوئی عدالتی کارروائی نہ ہو، میں کوئی جھگڑے والی بات نہ کروں، اگر آپ ڈرتے ہیں کہ آپ کی بہن اور بہنوئی کوئی جھگڑے والی باتیں کریں گے یا بچے کو لے جانے سے بہن کا دل ٹوٹ جائے گا تو آپ اسے چپ چاپ اٹھا کر لے آئیں۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"کوئی انوکھی بات نہیں کر رہی ہوں۔ آپ کی اماں جان نے میرے بچے کو اغوا کیا تھا، آج آپ اسی کو اغوا کرکے میرے پاس لے آئیں۔"

"تم مجھ سے ایسا کام لینا چاہتی ہو جو میں نے پہلے کبھی نہیں کیا۔"

"میں کتنی بار یاد دلاؤں، باتیں بنانے کا فن تمہارے کام نہیں آئے گا۔ مجھے بچہ چاہئے اور صبح ہونے سے پہلے چاہئے۔"

اس کے تیور بتا رہے تھے، وہ بچے کے معاملے میں میری ایک بات بھی نہیں مانے گی، اپنی بات منوا کر رہے گی۔ میں آہستگی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ دھیرے دھیرے چلتا ہوا ایک دیوار کے ساتھ یوں لگ گیا جیسے سر ٹکرانے کا ارادہ ہو۔ میری حالت ہی ایسی تھی یا تو مجھے ایک ماں کا مطالبہ پورا کرنا تھا یا پھر سر ٹکرا کر مرجانا تھا۔

میں نے کہا۔ "بچہ ہر حال میں تمہارا ہے تم ہر حال میں اسے جیت رہی ہو۔ کوئی تمہارے راستے میں دیوار نہیں بن سکے گا پھر غصے میں جلد بازی کیوں کر رہی ہو مجھے کچھ تو سوچنے کی مہلت دو۔"

"تاکہ مہلت ملتے ہی تم فراڈ کا پھر کوئی راستہ نکال سکو!"

"تم نے ہمیں ہر طرف سے جکڑ لیا ہے۔ قانون تمہارا ساتھ دے گا۔ عارف والا کے معززافراد تمہارا ساتھ دیں گے۔ میرے بہنوئی اس معاملے کو عدالت میں لے جانا پسند نہیں کریں گے۔ میری باجی جان کبھی طبی معائنے کے لئے راضی نہیں ہوں گی، اس طرح ان دونوں کی انسلٹ ہوگی۔ بات رشتے داروں تک پہنچے گی۔ پتا نہیں وہ عدالت سے مقرر کئے جانے والے ڈاکٹر کو خرید سکیں گے یا نہیں۔ وہ ایک بچے کو اغوا کرنے کا

جرم کرنے اور بدنام ہونے کا خطرہ مول لینا پسند نہیں کریں گے۔ تمہیں یقین ہو جانا چاہئے، اب ہم میں سے کوئی تمہارے ساتھ فراڈ نہیں کرسکے گا۔"

"مجھے پورا یقین ہے لیکن ہم جس دور میں جی رہے ہیں، وہاں کوئی بھی دہشت گرد گولیاں چلاتا ہوا، قتل کرتا ہوا گزر جاتا ہے اور اس کی کوئی وجہ نہیں ہوتی، قتل ہونے والے بے چارے بے قصور ہوتے ہیں۔ میں بھی بے قصور ہوں، آپ مجھے کسی سے قتل کرا سکتے ہیں۔ آج کل بے چاری بیویاں گہری نیند سوتی ہیں۔ شوہر آتے ہی ہتھوڑے مار مار کے اسے ہلاک کردیتے ہیں پھر عدالت میں بیان دیتے ہیں، بیوی بدچلن تھی اور شوہر نے غیرت میں آکر اسے قتل کردیا۔ تم اپنی بہن کی گود آباد رکھنے کے لئے عدالت میں مجھ کو بے غیرت کہہ دو گے تو یہ سارا قصہ ہی بدل جائے گا۔ عارف والا کے معززافراد میرے حق میں گواہی دیں گے لیکن آپ اسی بیان پر ثابت قدم رہیں گے کہ میرا کردار مشکوک تھا، اس لئے چھوڑ کر چلے آئے۔ تین برس بعد میں پھر اپنے لوگوں کی گواہیاں پیش کرکے جبراً آپ کی شریکِ حیات بن کر رہنا چاہتی ہوں، اس لئے آپ نے مجھے قتل کردیا۔ آپ کے اعتراف جرم کے بعد معاملہ بھی ٹل جائے گا اور یہ کیس بچے تک نہیں جائے گا کیونکہ بچے کا دعویٰ کرنے والی کو آپ قتل کرچکے ہوں گے۔"

میں نے جھنجلا کر کہا۔ "میں نے آج تک ایک چیونٹی نہیں ماری اور تم مجھے قاتل سمجھ رہی ہو۔"

"آپ بھلا چیونٹی کیوں ماریں گے، وہ تو ایک چٹکی میں مسلتے ہی مرجاتی ہے۔ آپ کو تو تڑپا تڑپا کر مارنے میں مزہ آتا ہے۔ کیا میں تین برس سے آپ کی درندگی نہیں دیکھ رہی ہوں؟"

میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے دس بجے تھے۔ وہ کہنے لگی۔ "میرے فیصلے پر غور کرنے اور عمل کرنے کے لئے پورے بارہ گھنٹے ہیں۔ کل صبح ٹھیک دس بجے میں کسی وکیل کے پاس جاؤں گی۔ مجھے یقین ہے، میں آپ کی عداوتوں کے باوجود زندہ رہوں گی۔ اگر کسی سازش کے تحت ماری گئی تو میری موت آپ کے پورے خاندان کے لئے مصیبت بن جائے گی۔ میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو ایک لفافہ دیا ہے اس لفافے

پر مہر لگادی ہے اور تاکید کی ہے جب تک میں زندہ ہوں اس لفافے کو نہ کھولا جائے۔ میری موت کے بعد اسے کھول کر قانونی کارروائی کی جاسکتی ہے۔ میں نے اس کے اندر ایک تفصیلی خط لکھا ہے' اپنی پوری روداد بیان کی ہے اور یہ واضح طور پر لکھا ہے کہ میرے شوہر غلام حسین' ان کی بہن اور بہنوئی کے پاس مجھے بچے سے محروم رکھنے کا ایک راستہ ہے کہ وہ مجھے قتل کردیں یا کسی سے قتل کرادیں لٰہذا! میری موت کے ذمے دار یہی تین افراد ہوں گے۔"

میں اس سے آگے نہ سن سکا۔ تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اس نے مجھے آواز نہیں دی' واپس نہیں بلایا۔ وہ جانتی تھی' میں ہر حال میں واپس آجاؤں گا اور بچے کے ساتھ آؤں گا۔ وہ اپنے معاملے میں ہر طرح سے مضبوط تھی اور پوری طرح تیار ہو کر آئی تھی۔

جن کی شادی ہو چکی ہے اور جن کی کوئی کمزوری ان کی بیوی کے ہاتھ آگئی ہے' وہ میری حالت سمجھتے ہوں گے۔ ایسے وقت وہ اپنے میاں کو ہر طرح سے مجبور کرکے اپنی بات منواتی ہیں' تب اتنا غصہ آتا ہے کہ جی چاہتا ہے' وہ گہری نیند میں ہو تو اس کے سر پر ہتھوڑے مار مار کر مار ڈالا جائے۔ مانا کہ ہم خطاوار ہوتے ہیں' ہم سے بہت بڑی غلطی ہوجاتی ہے یا بہت بڑا جرم ہو جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ بیوی سر پر چڑھ جائے اور اپنا ہر حکم جوتے مار کر منوائے۔

میں ہوٹل سے باہر آیا' اپنی کار میں بیٹھا پھر آہستہ آہستہ ڈرائیو کرتا ہوا باجی جان کی طرف جانے لگا۔ میری نگاہوں کے سامنے ان کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کس طرح انہیں بچے سے محروم کروں' وہ بہت روئیں گی اور میں ان کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا' ان سے صرف خون کا رشتہ نہیں تھا' ان سے وفاداری بھی شرط تھی کیونکہ برسوں سے ان کا نمک کھا رہا تھا۔

لیکن یہ بہن کے لئے جذبات میں بہنے کا وقت نہیں تھا۔ فیصلہ یہ کرنا تھا کہ اپنے بچے کو وہاں سے چرا کر لاسکتا ہوں یا نہیں؟ کوئی چیز چرا کر لے جانا میرے لئے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ میں پچھلے دس برسوں سے بہن کے گھر سے ہزاروں روپے چراتا آرہا تھا۔ باجی جان کو چوری کا علم تھا لیکن وہ نظرانداز کرتی تھیں۔ روٹی کھانے کے بعد

جھوٹا بچ جائے اور اسے بھائی کھائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ان کی نظروں میں ہزار دو ہزار کی کوئی اہمیت نہیں تھی کسی چیز کی اہمیت ہو اور اسے چرایا جائے تب اس کے خلاف اقدامات کئے جاتے ہیں۔

میرا بچہ ان کے لئے بہت اہم تھا۔ اس کے ذریعے انہوں نے اپنی سوکن کا راستہ روک رکھا تھا۔ اگر میں اپنے بچے کو چرا کر لاتا اور وہ دیکھ لیتیں تو مجھے گھر سے نکال دیتیں اور اگر میری چوری پکڑی نہ جاتی' بچہ مہناز کے پاس پہنچ جاتا تو میرے بہنوئی صاحب کے لئے دوسری شادی کا راستہ کھل جاتا۔ اس پہلو سے جس بہن نے میری پرورش کی تھی' مجھے دولت مند بنایا تھا' مجھے عیش و آرام دیا تھا' میں اس کا گھر اجاڑنے جارہا تھا۔

میں نے کوٹھی کے سامنے پورچ میں گاڑی روک دی۔ میں اتنی دیر میں فیصلہ کرچکا تھا کہ ساری زندگی کا جھگڑا مول لینے سے بہتر ہے جس کی امانت ہے اسے واپس کردی جائے۔ باجی جان اب دولت سے' مقدر سے اور تدبر سے بچے کو اپنے پاس نہیں رکھ پائیں گی۔ وہ دولت کے غرور میں مقدمہ کریں گی' مہناز کے خلاف مزید سازشیں کریں گی پھر بھی اپنی بدنصیبی سے نہیں لڑسکیں گی۔

میں کار سے اتر کر ڈرائنگ روم میں آیا' سوچ رہا تھا' بچے کو باجی جان کے بیڈ روم سے نکال کر لانا بہت دشوار ہوگا لیکن وہ ڈرائنگ روم میں تھا اور آیا اسے بہلانے کی کوشش کررہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

وہ بولی۔ "بیگم صاحبہ کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ صاحب ڈاکٹر کو لے کر آئے ہیں' بابا وہاں جانا چاہتے ہیں۔"

میں نے بیٹے کو اس سے لیا پھر پوچھا۔ "بیٹے! آئس کریم کھاؤ گے؟"

وہ روتے روتے چپ ہوگیا پھر بولا۔ "ہاں ماما' آئس کریم کھاؤں گا۔"

میں نے اسے گاڑی میں لاکر اگلی سیٹ پر بٹھایا۔ باجی جان کو ذرا سی چھینک آتی تھی تو میں تڑپ کر پوچھتا تھا' ڈاکٹر کو بلاؤں؟

لیکن آج میں نے بیڈ روم میں جاکر ان کی طبیعت نہیں پوچھی۔ ڈاکٹر کے آنے کا مطلب یہی تھا کہ زیادہ ہی طبیعت خراب ہے' لیکن یہ مزاج پرسی کا موقع نہیں تھا۔ میں

نے موقع سے فائدہ اٹھایا' اسے سیدھا ممتاز کے پاس لے آیا۔ اس نے بچے کو دیکھا تو چند لمحے تک دور ہی سے دیکھتی رہ گئی۔ یہ وہ بچہ تھا جو پیدا ہوتے ہی اس سے بچھڑ گیا تھا۔ اس نے آج تک اس کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ تین برس کے بعد دیکھ رہی تھی اور یقین کر رہی تھی کہ جس کے لئے تخلیق کے کرب سے گزرتی رہی تھی' یہ وہی ہے۔ اس کے پرس کے پاس سالگرہ کا دعوت نامہ پڑا ہوا تھا' جس میں ہمارے بچے کی تصویر تھی وہ دوڑتی ہوئی آئی پھر اسے گود میں اٹھا لیا۔ اس کے گالوں کو' اس کی آنکھوں کو' اس کے ہونٹوں کو' اس کی گردن کو چومنے لگی۔ اس وقت میرے دل کی گہرائیوں سے' میری روح کی گہرائیوں سے ندامت ابھری۔ میں نادم ہو کر ایک ماں کی دیوانگی کو دیکھ رہا تھا لیکن بچہ اس دیوانگی کو نہیں سمجھتا تھا' رونے لگا۔

میں نے کہا۔ "تم اس کے لئے اجنبی ہو۔"

وہ پیار کرتے کرتے ٹھٹک گئی۔ بڑے دکھ سے اپنے روتے ہوئے بچے کو دیکھنے لگی۔ تین برس ہو گئے اور اپنا بچہ اس کے لئے اجنبی تھا۔ اس نے پھر اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "میں ساری اجنبیت ختم کر دوں گی' اتنی ممتا دوں گی کہ تم ساری دنیا کو بھول جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "فی الحال یہ آئس کریم سے بہلایا جا سکتا ہے۔ یہاں سے فوراً نکلو' ہم ابھی کار کے ذریعے عارف والا جائیں گے۔"

اس نے چونک کر بے یقینی سے مجھے دیکھا پھر میرے ایک بازو کو تھام کر بولی۔ "کیا سچ کہہ رہے ہو' کیا میرا ساتھ دو گے؟"

"جب میں نے بچے کو بہن سے چھڑا لیا ہے تو اس کا مطلب ہے اس سے ہمیشہ کے لئے رشتہ توڑ دیا ہے۔ میری سمجھ میں آگیا ہے' میرا مستقل اور پائیدار رشتہ تم سے اور بچے سے ہے۔"

اس نے اپنا سامان سمیٹا۔ ہم ہوٹل سے باہر اپنی گاڑی میں آ گئے۔ راستے میں بیٹے کو آئس کریم کا ایک کپ کھانے کے لئے دیا۔ گاڑی کی ٹنکی پٹرول سے فل کی پھر وہاں سے چل پڑے۔ وہ بچے کو گود میں لئے اگلی سیٹ پر میرے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ "مجھے یقین نہیں آ رہا' آپ تین برس بعد میرا ساتھ دے رہے' جب

ہم ماں باپ ہو کر یہ کہہ دیں گے کہ بچہ ہمارا ہے اور عارف والا کے لوگ ازدواجی رشتے کی گواہی دیں گے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت مجھے میرے بچے سے جدا نہیں کر سکے گی۔"

"تم میری طرف سے مطمئن رہو۔ میں خود نہیں چاہتا' یہ معاملہ عدالت میں جائے اور میری باجی کی توہین ہو۔"

ہم عارف والا پہنچ گئے۔ ممتاز نے وہ مکان فروخت کر دیا تھا۔ وہاں کے کونسلر' پٹواری' ہیڈ ماسٹر اور یونین کے چیئرمین نے کہا۔ "صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے معاف کر دینا چاہئے لہٰذا ہم تمہیں معاف کرتے ہیں اور نصیحت کرتے ہیں' اپنے بیوی بچے کے ساتھ اچھی اور شریفانہ زندگی گزارو۔"

انہوں نے اپنے ہاں ایک ایک دن مہمان رکھا پھر ہم نے ایک کرائے کا مکان لیا۔ ان کی مدد سے ایک بہت بڑا پلاٹ خریدا تاکہ وہاں اپنے لئے مکان تعمیر کرا سکیں ہم باجی جان اور بہنوئی صاحب کی دولت' طاقت اور غرور سے اسی آبادی میں محفوظ رہ سکتے تھے کیونکہ وہاں ہمارے بے شمار حمایتی تھے۔

عارف والا پہنچ کر میں پہلے دن بہت گھبرایا ہوا تھا۔ باجی جان اور بہنوئی صاحب یقیناً بچے کو تلاش کر رہے ہوں گے۔ اس کی گمشدگی کی رپورٹ بھی لکھوائی ہو گی۔ تلاش میں ناکامی کے بعد وہ عارف والا بھی پہنچ سکتے تھے۔ کونسلر صاحب نے کہا۔ "فکر نہ کرو' میں پولیس والوں سے نمٹ لوں گا۔"

پٹواری نے کہا۔ "ہم یہاں ایک نہیں' سینکڑوں ہیں' ہزاروں ہیں۔ ہمارے درمیان رہ کر تم اپنے بہن اور بہنوئی سے مرعوب ہونا چاہو گے تو ہم تمہیں ان کے رعب میں آنے نہیں دیں گے۔ تمہیں ہر حال میں سچ کہنا ہے اور اپنے بچے کو اپنا نام دینا ہے۔"

میرا بیٹا بار بار روتا تھا اور میری باجی جان کو یاد کرتا تھا لیکن ممتاز بہت سلیقے والی عورت ہے پھر ممتا کا جذبہ بھی کم نہیں ہوتا۔ اس نے دوسرے دن تک بچے کو بڑی حد تک مانوس کر لیا۔ ایک ہفتے کے اندر وہ اس سے گھل مل گیا۔ کبھی کبھی باجی کو یاد کرتا تھا اور بھول جاتا تھا۔ میں روز اخبارات پڑھا کرتا تھا' شاید ہمارے خلاف کوئی خبر شائع

کرائی گئی ہو لیکن کوئی خبر نہیں تھی۔ میں حیران تھا' ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد بھی کسی نے میری اور بچے کی خبر نہیں لی تھی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ دو ہفتے گزر گئے پھر ایک مہینہ گزر گیا۔ میری بے چینی بڑھنے لگی۔ پہلے مجھے خوف تھا' باجی جان اور بہنوئی صاحب بچے کا مطالبہ کرنے آئیں گے تو کیا ہوگا؟ اب یہ بے چینی تھی' وہ کیوں نہیں آرہے ہیں؟

جب دوسرا مہینہ بھی گزر گیا تو میں نے باجی جان سے ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ قائم کرنا چاہا۔ رابطہ قائم ہوا تو گھر کی آیا کی آواز سنائی دی۔ میں نے کہا۔ "باجی جان کہاں ہیں' بلاؤ! میں ابھی بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"وہ گھر میں موجود نہیں ہیں' لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا ابھی تک طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی' کیا بچے سے دور ہونے کے بعد ان کی طبیعت اور زیادہ خراب ہوگئی ہے؟ میں ان سے بچے کے بارے میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں' اگر صاف صاف بات نہیں کروں گا تو وہ بچے کے لئے اسی طرح بیمار پڑتی رہیں گی۔"

آیا نے کہا۔ "جناب ایسی کوئی بات نہیں ہے' وہ تو بچے کو بالکل یاد نہیں کرتی ہیں۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟"

"سچ کہہ رہی ہوں' آپ کی باجی جان ماں بننے والی ہیں۔"

یہ ایسی دھماکہ خیز اطلاع تھی کہ فوراً ہی یقین نہیں آسکتا تھا۔ میں نے بار بار پوچھا' اس نے بار بار کہا۔ تب میں نے خوش ہو کر کہا۔ "تب تو میری باجی جان بہت ہی خوش ہوں گی۔"

اچانک ہی لائن کٹ گئی۔ میں نے ہیلو ہیلو کہہ کر پکارا پھر ریسیور رکھ کر سوچا' دوبارہ بات کرنا چاہئے' پوری تفصیل معلوم کرنا چاہئے پھر سوچا۔ ایک آیا سے کیا بات کروں گا۔ باجی جان گھر میں موجود نہیں ہیں۔ میں دوڑا ہوا ممتاز کے پاس آیا۔ اسے یہ خوشخبری سنائی تو اس نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔ کہنے لگی۔ "اب ہم پر سے ہمیشہ کے لئے بلا ٹل گئی ہے' وہ ہمارے بچے کے لئے دعویٰ نہیں کریں گی۔"

"ممتاز' مجھے باجی جان کے پاس جانا ہے' ان کی خوشی میں شریک ہونا چاہئے۔ اس وقت انہیں میری ضرورت ہوگی بلکہ ہم دونوں کی ضرورت ہوگی۔ اگر تم ان کی سازشوں کو بھول جاؤ' انہیں معاف کردو تو ایسے وقت ان کے بہت کام آسکتی ہو۔"

وہ بولی۔ "میرے دل میں خدا کا خوف ہے' میں دشمنوں سے انتقام لینا نہیں چاہتی' یہ باتیں اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیتی ہوں۔ اگر مجھے باجی جان کی خدمت کا موقع ملا تو میں دل و جان سے خدمت کروں گی۔"

"تو پھر آج ہی لاہور چلیں گے۔"

"میں ابھی بچے کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ پہلے آپ جائیے' وہاں کے حالات معلوم کیجئے' ان کا مزاج اب کیسا ہے' وہ کیا چاہتی ہیں۔ اگر ان کا مزاج دوستانہ ہوگا تو میں ضرور بچے کے ساتھ وہاں پہنچ جاؤں گی۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا۔ "ممتاز جن کے دلوں میں اللہ کا خوف ہوتا ہے' انہیں اللہ تعالیٰ سیدھی راہ دکھاتا ہے' ان کی غلطیوں کو معاف کرتا ہے اور انہیں انعام بھی دیتا ہے۔ باجی جان کے لئے اس سے بڑا انعام کیا ہوگا کہ وہ دس برس کے بعد ماں بن رہی ہیں۔"

ممتاز نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا پھر بولی۔ "میں نہیں مانتی۔ میں باجی جان کی غلطیوں کو معاف کر رہی ہوں لیکن میرا ایمان ہے' اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہیں کرے گا۔"

میں نے ذرا ناگواری سے پوچھا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"وہی جو اب تک آپ لوگ سمجھ نہیں پائے۔ آپ جسے خوفِ خدا کہتے ہیں' وہ دراصل آپ لوگوں کی مصلحت اندیشی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں جس طرح انسان کو انسان کے فراڈ کا پتا نہیں چلتا اس طرح (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کو بھی معلوم نہیں ہوتا اور زبان سے یہ کہہ دینے کے بعد کہ خوفِ خدا ہے' اللہ خوش ہو جاتا ہوگا اور یونہی سارے گناہوں کو معاف کر دیتا ہوگا' میں نہیں مانتی۔"

"تمہارے نہ ماننے سے حقیقت نہیں بدلے گی۔ باجی کو دولت' عزت' شہرت سب کچھ ملتا رہا اور اب اولاد بھی مل رہی ہے۔ کیا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام

نہیں ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "بعض حالات میں اللہ کی قدرت سمجھ میں نہیں آتی' اس معبود کا منشا کیا ہے اور کیوں گناہ گاروں کو ڈھیل دیتا ہے اور انعامات سے نوازتا ہے' یہ وہی جانتا ہے۔ اگر ہم مشیت خداوندی کو سمجھ نہ پائیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم خوفِ خدا صرف زبان پر رکھیں۔ دل میں نہ رکھیں۔"

میں نے اس سے بحث نہیں کی۔ دو چار دنوں کے لئے لاہور آگیا۔ گھر پہنچا تو اتنی بڑی کوٹھی میں عجیب سی ویرانی تھی۔ کوئی ملازم نہیں تھا' آیا بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے کال بیل کے بٹن کو دبایا' پھر جواب کا انتظار کیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر بٹن دبایا پھر انتظار کیا۔ دو چار بار بٹن دبانے کے بعد مایوس ہوگیا۔ وہاں سے جانا چاہتا تھا کہ باجی جان کی کار احاطے میں داخل ہوئی اور میری کار کے پیچھے آکر رک گئی۔ پہلے میں ان کی گاڑی ڈرائیو کرتا تھا اور وہ آرام سے بیٹھی رہتی تھیں' آج وہ خود ڈرائیو کرتی ہوئی آئی تھیں۔ کار سے باہر نکل کر ہم بھائی بہن کی نظریں ملیں تو انہوں نے فوراً نظریں جھکالیں۔ آیا ان کے ساتھ آئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازے کو چابی سے کھولا' باجی جان تیزی سے چلتی ہوئی میرے سامنے سے گزرتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے آیا' وہ کچھ کہے سنے بغیر اوپری منزل پر اپنے بیڈ روم میں چلی گئیں۔ میں نے صاف طور پر دیکھا تھا' زینے پر چڑھتے وقت وہ رو رہی تھیں اور آنکھیں پونچھتی جارہی تھیں۔

میں نے پلٹ کر آیا سے پوچھا۔ "کیا بات ہے' خیریت تو ہے؟ کیا باجی ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں؟ لیڈی ڈاکٹر کیا کہتی ہے؟ یہ ماں تو بن رہی ہیں نا؟"

"جی ہاں' لیڈی ڈاکٹر نے یقین دلایا ہے۔"

"پھر باجی جان کیوں رو رہی ہیں؟"

"کیا بتائیں صاحب ان کا گھریلو معاملہ ہے۔ میں ایک ملازمہ ہوں' اپنی زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتی' آپ خود ہی پوچھ لیں۔"

میں تیزی سے زینے پر چڑھتا ہوا اوپر آیا پھر ان کے دروازے پر دستک دی۔ ان کی آواز سنائی دی۔ "آجاؤ۔"

میں دروازہ کھول کر گیا۔ وہ بستر کے سرے پر سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کیا بات ہے' میں تو سمجھ رہا تھا کہ یہاں خوشیاں منائی جارہی ہوں گی اور بے شک یہ بہت ہی خوشی کا موقع ہے۔ آپ دس برس بعد ماں بن رہی ہیں۔"

وہ بدستور سر جھکائے خاموش بیٹھی رہیں۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے کہا۔ "باجی جان! میں آپ کا مجرم ہوں' آپ سے کچھ کہے سنے بغیر بچے کو لے گیا لیکن آپ کی بھلائی کے لئے ہی گیا تھا۔ عارف والا کے معزز لوگ مہناز کے ساتھ ہیں۔ انہوں نے مجھے پہچان لیا ہے اور یہ بات بھی کھل گئی ہے کہ آپ کے پاس جو بچہ ہے' وہ مہناز کا ہے اور مہناز نے دھمکی دی تھی' اگر آپ سیدھی طرح وہ بچہ اس کے حوالے نہیں کریں گے تو ڈاکٹروں سے آپ کا طبی معائنہ کرائے گی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ ماں بننے والی ہیں۔ اگر معلوم ہوتا تو مہناز کی یہ دھمکی بے اثر ہو جاتی' یہ ثابت ہو جاتا کہ آپ آج ماں بن رہی ہیں تو اس سے پہلے بھی آپ نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے جو اب تین برس کا ہو چکا ہے۔"

میں کہہ رہا تھا لیکن وہ کوئی اثر نہیں لے رہی تھیں۔ چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ "آخر بات کیا ہے؟ آپ ماں بن رہی ہیں تو آپ کو خوشی کیوں نہیں ہے؟"

وہ پھر رونے لگیں۔ میں ان کے پاس آکر بستر کے سرے پر بیٹھ گیا پھر ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "باجی جان! میں نے زندگی میں صرف ایک بار آپ کو دھوکا دیا' ورنہ آج بھی آپ کا وفادار ہوں۔ آپ کے لئے جان دے سکتا ہوں۔ بتائیے آپ کو کیا دکھ ہے؟"

وہ روتے ہوئے بولیں۔ "مجھے ماں بننے کی بے حد خوشی ہو رہی تھی لیکن......... لیکن.........."

وہ بات پوری نہ کرسکیں۔ سسکنے لگیں۔ میں ان کے شانے کو محبت سے تھپک رہا تھا۔ ان کے سر کو سہلا رہا تھا پھر انہوں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "تمہارے بہنوئی صاحب اسے اپنا بچہ تسلیم نہیں کررہے ہیں۔"

مجھے ایک جھٹکا سا لگا‘ میں پیچھے ہٹ گیا پھر میں نے غصے سے کہا۔ ”یہ کیا بکواس ہے‘ وہ تسلیم کیوں نہیں کر رہے ہیں۔ آپ میری بڑی بہن نہیں‘ میری ماں کے برابر ہیں۔ اگر کوئی آپ کے کردار پر کیچڑ اچھالے تو میں برداشت نہیں کروں گا‘ خواہ وہ میرے بہنوئی کیوں نہ ہوں۔“

”ہادی‘ تم طیش میں آکر کچھ نہیں کر سکتے‘ غلطی ہماری ہے۔ تمہیں یاد ہے‘ میں نے تمہارے بہنوئی کو بانجھ ثابت کرنے کے لئے ڈاکٹر کو رشوت دی تھی کہ وہ کبھی باپ نہیں بن سکیں گے؟“

میں نے کہا۔ ”اوہ خدایا! تو کیا وہ ابھی تک اس رپورٹ کو تسلیم کر رہے ہیں؟“

”ہاں‘ جب میں نے خوشخبری سنائی کہ میں ان کے بچے کی ماں بننے والی ہوں تو انہوں نے چھوٹتے ہی میرے منہ پر طمانچہ مار دیا۔ کہنے لگے‘ میڈیکل رپورٹ جھوٹی نہیں ہو سکتی۔ میں نے کہا۔ وہ جھوٹی تھی۔ میں نے سوکن کا راستہ روکنے کے لئے ڈاکٹر کو رشوت دی تھی۔

”انہوں نے کہا۔ تم نے صرف سوکن کا راستہ نہیں روکا بلکہ اپنے بھائی کے بچے کو میرا بیٹا بنا کر اسے میری تمام دولت اور جائیداد کا مالک بنانا چاہا۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ ایک سوکن کو برداشت کر لوں گی تو اس سے میری اولاد ہو گی‘ وہ میرا خون ہو گا‘ وہ میرا سچا وارث ہو گا‘ پھر میں نے کہا آج دس برس بعد میں اسی سچے وارث کو جنم دینے جا رہی ہوں۔ آپ انکار کیوں کر رہے ہیں؟ کہنے لگے۔

”جب تک مجھے صحیح میڈیکل رپورٹ معلوم نہیں ہو گی‘ میں انکار کرتا رہوں گا اور اگر یہ ثابت ہو گیا کہ میں واقعی باپ نہیں بن سکتا تو تم ابھی سے اپنا کوئی دوسرا ٹھکانا ڈھونڈنا شروع کر دو۔“

”میں ابھی ٹیلی فون کے ذریعے اپنے فیملی ڈاکٹر سے رابطہ قائم کرتی ہوں وہ ابھی آپ کو بتائے گا‘ یقین دلائے گا۔“

باجی اپنی روداد سنا رہی تھیں اور میں سن رہا تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا‘ پتا چلا وہ گھر میں نہیں ہے پھر اسپتال میں فون کیا‘ وہاں بھی رابطہ قائم نہیں ہوا۔ باجی جان نے کہا۔ ”میں شام تک ڈاکٹر کو ڈھونڈ لاؤں گی اور آپ کے سامنے اس سے سچ

اگلواؤں گی۔“

باجی جان شام کو ڈاکٹر کے پاس گئیں‘ اس سے ملاقات ہوئی انہوں نے کہا۔ ”جو میڈیکل رپورٹ آپ نے غلط دی تھی اسے درست کر دیجئے‘ ورنہ میری زندگی برباد ہو رہی ہے‘ میرا گھر تباہ ہو رہا ہے۔ میں اپنے شوہر کے بچے کی ماں بننے والی ہوں لیکن وہ میڈیکل رپورٹ کے مطابق میرے بچے کو اپنا بچہ ماننے سے انکار کر رہے ہیں۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں تم نے کہا تھا۔ رپورٹ غلط دوں‘ میں نے دے دی۔“

باجی جان نے پوچھا۔ ”صحیح رپورٹ کیا ہے؟“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”یہی کہ تمہارا شوہر باپ بن سکتا ہے۔“

”تو پھر آپ یہی رپورٹ لکھ دیں۔“

”کیا یہ رپوٹ لکھ کر یہ ثابت کر دوں کہ میں نے رشوت لے کر پہلے غلط رپورٹ لکھی۔ کیا میں خود کو قانون کی نظروں میں مجرم قرار دے سکتا ہوں؟ پلیز! آپ آئندہ ایسی بات نہ کریں۔“

”میں لٹ رہی ہوں‘ برباد ہو رہی ہوں۔ میں اس سے زیادہ رقم دوں گی‘ پہلے پچیس دیئے تھے آج پچاس دوں گی مگر رپوٹ بدل دیجئے۔“

”اچھی بات ہے‘ آپ اپنے میاں کو میرے پاس بھیج دیں۔ میں طبی معائنہ کروں گا پھر تمہارے حق میں رپورٹ دوں گا کہ وہ باپ بن سکتے ہیں اور یہ درست بھی ہے۔“

باجی جان نے گھر آکر میرے بہنوئی صاحب سے کہا۔ ”ڈاکٹر کی صحیح رپورٹ یہی تھی‘ آپ باپ بن سکتے ہیں لیکن آپ یقین نہیں کریں گے اور ڈاکٹر بھی آپ کو پچھلی رپورٹ بدل کر نہیں دے گا لہٰذا آپ دوبارہ طبی معائنہ کرائیں‘ اس طرح آپ کا شک دور ہو جائے گا اور ہمارا گھر برباد ہونے سے بچ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے تم نے آج تک جو کچھ کہا‘ میں نے کیا لیکن اب اس ڈاکٹر پر مجھے بھروسا نہیں ہے ہم کسی دوسرے ڈاکٹر کے پاس جائیں گے تم جس سے کہو گی‘ میں اس سے معائنہ کراؤں گا۔ اگر رپورٹ تمہارے حق میں ہوئی تو میں باپ بننے کی خوشیاں

منائوں گا' ورنہ یہ ثابت ہو جائے گا کہ بچہ میرا نہیں ہے اور تم بدچلن ہو' اور کوئی بدچلن عورت بیوی بن کر نہیں رہ سکتی۔ میں تمہیں طلاق دوں گا اور دوسری شادی کرلوں گا۔"

یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا' پلیز! باجی جان' بتایئے کیا ہوا؟"

وہ روتے ہوئے بولیں۔ "دوسرے ڈاکٹر نے رپورٹ دی کہ وہ باپ نہیں بن سکتے۔"

میں نے غصے سے کہا۔ "وہ جھوٹ کہہ رہا ہے' فراڈ کررہا ہے پہلا ڈاکٹر آپ سے اعتراف کرچکا ہے کہ وہ باپ بن سکتے ہیں۔"

"اس نے صرف میرے سامنے اعتراف کیا ہے' مگر اس کا بھی تحریری بیان یہی ہے کہ وہ باپ نہیں بن سکتے۔ پہلی کلہاڑی میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے پاؤں پر ماری ہے۔ دوسری کلہاڑی انہوں نے ماردی۔ اب دو ڈاکٹروں کی یکساں رپورٹ ہے کہ وہ باپ نہیں بن سکتے۔ انہوں نے مجھے دھمکی دی ہے کہ میں بات آگے نہ بڑھاؤں' چپ چاپ طلاق لے لوں۔ اگر طلاق لینے کے لئے عدالت تک جاؤں گی تو وہ عدالت میں بیان دیں گے کہ میں نے اس سے پہلے بھی فراڈ کیا تھا۔ تین برس پہلے بھائی کے بچے کو گود لیا تھا اور یہ دھوکا دیا تھا کہ یہ کنور آفتاب احمد کا بیٹا ہے یعنی تمہارے بہنوئی جو ہمارے فراڈ میں شامل تھے' وہ اس سے بالکل الگ ہو رہے ہیں۔ انجان بن رہے ہیں اور سارا الزام مجھے دے رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ تین برس پہلے بھی میں نے ایک بچے کا فراڈ کیا' آج بھی کررہی ہوں۔"

میرا سر چکرا رہا تھا۔ ہم کوئی برائی کرتے ہیں پھر اللہ کے ڈر سے اس کی تلافی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ تلافی ہوگئی۔ ہمیں معافی مل چکی ہے۔ ہم دل کو سمجھاتے ہیں کہ ہم نے اللہ کو راضی کرلیا ہے۔

باجی جان نے چپ چاپ طلاق لینے سے انکار کیا تھا۔ معاملہ عدالت تک پہنچا پھر فیصلہ ہوا کہ کنور آفتاب احمد کا طبی معائنہ کرایا جائے' اس کے لئے ایک ڈاکٹر مقرر کیا گیا۔ باجی جان کے دل میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ میرے بہنوئی پھر فراڈ

کریں گے' وہ سرکاری ڈاکٹر کو بھی خریدنے کی کوشش کریں گے جو عدالت کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے۔ یہ سوچ کر باجی جان اس ڈاکٹر سے ملنے گئیں' اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "جو صحیح رپورٹ ہے' وہ دیجئے گا۔"

ڈاکٹر نے پوچھا۔ "اگر صحیح رپورٹ یہ ہوئی کہ وہ باپ نہیں بن سکتے تب؟"

تب باجی جان نے اپنے بیگ سے پانچ بڑی بڑی گڈیاں نکالیں اور کہا۔ "یہ پچاس ہزار روپے ہیں' ہر صورت میں رپورٹ میرے حق میں ہونا چاہئے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ اطمینان سے جائیں۔ رپورٹ آپ کے حق میں ہوگی۔"

دوسرے دن ڈاکٹر نے عدالت میں وہ پچاس ہزار روپے جج کے سامنے رکھ دیئے اور کہا۔ "رخسانہ بیگم نے یہ بھاری رقم مجھے دی ہے اور میڈیکل رپورٹ اپنے حق میں چاہتی ہیں۔ میں نے ابھی تک کنور آفتاب احمد کا معائنہ نہیں کیا ہے۔ کیا اتنی بڑی رشوت حاصل کرنے کے بعد اب معائنہ کرنا ضروری رہ گیا ہے.......... یا اس خاتون کا فراڈ کھل چکا ہے۔"

جج نے فیصلہ سنادیا کہ باجی جان فراڈ ہیں۔ انہوں نے صرف اپنے خاوند کو بار بار دھوکا نہیں دیا بلکہ عدالت کو بھی دھوکا دینے کے لئے رشوت دینے کا جرم کیا ہے لہٰذا رشوت میں دی ہوئی پچاس ہزار کی رقم جرمانے کے طور پر ضبط کی جاتی ہے اور ایک عورت کے لئے یہ سزا کافی ہے کہ اس کے خاوند کی طرف سے دی ہوئی طلاق کی درخواست منظور کرلی جائے۔

باجی جان اس فیصلے پر چیختی چلاتی رہیں' یقین دلانے کی کوشش کرتی رہیں کہ انہوں نے آج تک ساری دنیا سے فراڈ کیا ہے لیکن اپنے شوہر سے کبھی نہیں کیا لیکن کوئی ان کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ طلاق ہو چکی تھی میرے بہنوئی صاحب نے نہ صرف دھوکے کا جواب باجی جان کو دھوکے سے دیا تھا بلکہ ان کی نیت پہلے ہی دوسری شادی کی تھی۔ ایک حسین عورت سے رومانس چل رہا تھا' اب انہوں نے اس سے شادی کا اعلان کردیا تھا۔ طلاق کے بعد باجی جان مفلس اور کنگال نہیں تھیں' کسی مرد کی محتاج نہیں تھیں۔ جس طرح میں نے ہیرا پھیری سے لاکھوں روپے جمع کئے تھے اسی طرح باجی جان نے بھی کوئی ساٹھ ستر لاکھ تو ضرور جمع کئے ہوں گے۔ جس

کوٹھی میں وہ رہ رہی تھیں' وہ ان کے ہی نام تھی۔ انہیں دولت اور جائیداد کی کمی نہیں تھی لیکن وہ اپنی زندگی کی بہت بڑی بازی ہار چکی تھیں۔ انہوں نے بڑے بڑے فراڈ کر کے ایک پرائے بچے کو اپنے شوہر کا نام دیا تھا۔ پورے دس برس نو ماہ بعد انہوں نے اپنے بچے کو جنم دیا تو اسے اس کے اپنے ہی باپ کا نام نہ مل سکا کیونکہ وہ شوہر کی نظروں میں میڈیکل رپورٹ کے مطابق عدالتی فیصلے کے مطابق آوارہ اور بدچلن تھیں اور انہوں نے ایک ناجائز بچے کو جنم دیا تھا۔

میں اس ذلت بھرے انجام سے لرز رہا ہوں۔ ایک سیدھی اور سچی بات جو موٹی سی عقل سے بھی سمجھ میں آجاتی ہے' وہ اتنے برے انجام تک پہنچنے کے بعد سمجھ میں آئی کہ خوفِ خدا زبان پر نہیں۔ دل میں ہونا چاہئے۔

☆------☆------☆

ضرورت

ایک بدشکل اور کالے کلوٹے پہلوان کی عبرتناک کہانی جسے اپنے لئے گوری چٹی اور خوبصورت عورت کی تلاش تھی جو اس کیلئے گورے گورے گول مٹول سے بچے پیدا کر سکے۔ وہ گوریوں کے پیچھے بھاگ رہا تھا اور ایک کالی اس کے پیچھے تھی۔ اپنی اپنی ضرورتوں کے غلام لوگوں کا دلچسپ واقعہ۔

نور بیگم کے چہرے پر نام کو نور نہیں تھا۔ شاید ماں باپ نے بھی اس کالی کلوٹی کا مذاق اُڑانے کے لئے اس کا یہ نام رکھ دیا تھا یا پھر جیسا کہ کہا جاتا ہے 'اولاد گوری ہو یا کالی' ماں باپ کے لئے وہ چاند کا ٹکڑا ہوتی ہے۔ بہرحال وجہ تسمیہ جو کچھ بھی ہو وہ بے چاری اپنی کالی صورت دیکھتی تھی اور کسی کو اپنا نام نور بیگم بتاتے ہوئے ہچکچاتی تھی۔

اس کے نصیب بھی کالے تھے۔ اس کی پیدائش کے چھ ماہ بعد باپ مرگیا۔ ماں اسے طعنے دیتے ہوئے پرورش کرتی رہی کہ اس چڑیل نے پیدا ہوتے ہی اپنے باپ کو کھا لیا ہے اور کسی دن ماں کو بھی کھا جائے گی۔ جب وہ آٹھ برس کی ہوئی تو ماں نے بیماری کی حالت میں وہی طعنہ دیا اور طعنہ دینے کے چند سیکنڈ بعد ہی مرگئی۔

نور بیگم کو آٹھ برس کی عمر میں پہلی بار یقین آیا کہ وہ سچ مچ چڑیل ہے۔ اس روز وہ خوب روئی۔ اسے ماں کی موت سے زیادہ اپنے چڑیل ہونے کا دکھ تھا۔ وہ اس دنیا سے کہیں دور چلی جانا چاہتی تھی حالانکہ موت سے پہلے کوئی دنیا سے دور نہیں جاسکتا۔ ابھی وہ یہ باتیں نہیں سمجھتی تھی جب محلے کے لوگ اس کی ماں کی تجہیز و تکفین کے لئے چندہ کررہے تھے، اس وقت وہ وہاں سے بھاگ گئی۔

بھاگتے بھاگتے اس نے دیکھا کہ دنیا کہیں ختم نہیں ہورہی ہے، ہر جگہ انسان اور حیوان نظر آرہے تھے جو اسے چڑیل سمجھ کر اس سے دور بھاگ سکتے تھے۔ آخر وہ تھک ہار کر ایک جگہ گر پڑی۔ پہلے بھاگنے کے دوران ڈوبتی ہوئی شام کا اجالا تھا۔ اب اس کے چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ جب لوگ چھوٹ جائیں، باپ کے بعد ماں بھی بچھڑ جائے، روشنی بھی ساتھ چھوڑ دے۔ اس دنیا کی کوئی چیز آس پاس نظر نہ آئے، تب وہ تاریکی سمجھاتی ہے کہ ہم دنیا سے دور ہوچکے ہیں۔

وہ رونے لگی۔ "ابا۔ اماں جی! کہاں ہو تم؟"

اب وہ دنیا سے دور نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ دور رہنے سے ایسا کھا جانے والا اندھیرا ملتا ہے۔ اس اندھیرے میں کہیں سے دھپ دھپ کی آواز سنائی دی، جیسے ہاتھی اپنے بھاری قدم زمین پر مارتا آرہا ہو۔ اس نے ایک کہانی میں سنا تھا کہ تاریکی میں دیو پریوں کو پکڑنے آتے ہیں۔ وہ کون سی حور پری تھی کہ کوئی دیو اسے پکڑنے آتا۔ مگر اس نے سہم کر دیکھا۔ ایک دیو اچانک ہی کہیں سے آکر اس کے سامنے دونوں ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہوگیا تھا۔

اس کا قد کوئی ساڑھے چھ فٹ رہا ہوگا۔ بدن چٹان کی طرح سخت اور سیاہ تھا۔ اس کی مناسبت سے چہرہ بھی کالا تھا۔ اندھیرے میں سفید دیدے اور اجلے دانت چمک رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ دیدوں کے ہتھیار سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردے گا اور دانتوں سے چبا چبا کر کھا جائے گا۔ وہ اس قدر دہشت زدہ ہوئی کہ چیخنے کی بھی جرأت نہ کرسکی۔

دیو کی گرجتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "کون ہو تم؟"

اس نے نور بیگم کا ایک ہاتھ کھینچ کر اسے ایک جھٹکے سے کھڑا کردیا۔ دیو کا ہاتھ لانبا اور ہتھیلی ایسی پھیلی ہوئی تھی کہ اس ہتھیلی کی گرفت میں وہ چیونٹی لگتی تھی۔

اس نے پوچھا۔ "کیا گھر سے بھاگ کے آئی ہے؟"

اس نے ہاں کے انداز میں اوپر نیچے سرہلایا۔

"گھر سے کچھ چرا کے لائی ہے؟"

اس نے نہیں کے انداز میں دائیں بائیں سرہلایا۔

"میرے ساتھ چلے گی؟"

وہ سہم کر پیچھے ہٹنے لگی۔ انکار میں سرہلانے لگی۔ دیو نے ایک ہاتھ سے اس کی پتلی سی گردن کو جکڑ کر کہا۔ "حرامزادی! یہیں گلا دبا کے مار ڈالوں گا۔ زندہ رہنا چاہتی ہے تو ذرا بھی آواز نہ نکالنا۔"

یہ دھمکی دے کر اس نے اسے اٹھا کر اپنی بغل میں داب لیا۔ ایک ریڑھے پر مویشیوں کا چارہ لدا ہوا تھا۔ اس نے نور بیگم کو چارے پر پھینک دیا۔ پھر ریڑھے کو

دھکیلتے ہوئے ایک کچی سڑک پر جانے لگا۔ وہ چپ چاپ سہمی ہوئی چارے پر پڑی رہی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ اس کا ہاتھ کتنا بڑا اور سخت ہے۔ گردن کو ذرا پکڑنے سے دم نکلنے لگا تھا۔ وہ مرنے سے ڈرتی تھی۔ اس لئے دل ہی دل میں اس دیو کے مرنے کی دعائیں مانگتی رہی۔

پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ وہ فاصلوں کا حساب نہیں جانتی تھی کہ اپنی مُردہ ماں سے کتنی دور چلی آئی ہے۔ جب اس دیو نے اسے چارے پر سے اتار کر زمین پر ڈالا تب اس نے کسی گاؤں کے کچے مکان کے سامنے خود کو پایا۔ لالٹین کی زرد روشنی میں ایک بوڑھی عورت نے اسے دیکھ کر دیو سے پوچھا۔ "ارے صمدو! اس بچی کو کہاں سے اٹھا کر لے آیا ہے؟"

"ارے ماں! یہ بچی نہیں ہے۔ قد میں تیرے برابر ہوگی۔ دو چار برس میں جوان ہو جائے گی۔ پھر میں اسے جورو بنالوں گا۔"

وہ چارہ اٹھا کر باڑے میں جا رہا تھا جہاں بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ لالٹین کی روشنی میں صمدو کا چہرہ اور بھیانک لگ رہا تھا۔ وہ ریڑھے سے چارہ اٹھا اٹھا کر ایک طرف ڈالتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "ماں! تیرے نصیب میں گوری اور خوبصورت بہو نہیں ہے۔ حسین لڑکیوں کے ماں باپ مجھے دیکھ کے ڈر جاتے ہیں۔ پھر جو لڑکیاں ذرا خوبصورت ہوتی ہیں وہ نخرے زیادہ دکھاتی ہیں، کیوں ٹھیک ہے نا؟"

ماں نے نور بیگم کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر زمین پر سے اٹھایا۔ وہ آٹھ برس کی تھی مگر قد میں اس بوڑھی کے برابر تھی۔ اس نے کہا۔ "بیٹی! اپنے گھر واپس جانا چاہو گی تو میں پہنچا دوں گی۔ میرے پاس رہو گی تو ماں کا پیار دوں گی۔"

نور بیگم کو وہ عورت ماں سے زیادہ اچھی لگی۔ وہ کوئی جواب نہ دے کر نئی ماں سے لپٹ گئی۔ اس کی ماں نے کئی بار کہا تھا کہ اس کالی اور بے ڈھنگی سے کوئی شادی نہیں کرے گا۔ کوئی اس پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرے گا لیکن صمدو نے اسے پسند کیا تھا۔ اس سے بیاہ رچانے کے لئے اسے شہر سے اٹھا کر لایا تھا۔ بعض ٹھکرائی ہوئی لڑکیاں اس طرح بھی اپنی قدر و قیمت کا اندازہ لگاتی ہیں کہ کوئی انہیں اٹھا کر لے جائے۔ اس سے

صمدو اسے اچھا لگا حالانکہ وہ بچگانہ ذہن سے سوچ رہی تھی۔ تاہم بچپن میں بھی عورت پن ضرور ہوتا ہے۔

رفتہ رفتہ وہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے لگی۔ اگرچہ صمدو سخت مزاج تھا۔ اسے کبھی گالیاں دے کر اور کبھی مار مار کر بھینسوں کی خدمت کرنا سکھاتا تھا۔ پھر بھی وہ اچھا لگتا تھا۔ نور بیگم نے جلد ہی گوبر کے کنڈے بنانا، بھینسوں کو نہلانا اور ناند میں ان کے لئے چارہ بنانا سیکھ لیا۔ دراصل ہر چیز کی اپنی ایک مناسب جگہ ہوتی ہے۔ حسین لڑکیاں ہیرے جواہرات سے سجائی جاتی ہیں۔ شاعروں کی محفل میں موضوعِ سخن بنتی ہیں۔ بدصورت لڑکیاں گوبر کے اُپلے تھاپتی ہیں اور اپنے رنگ کی مناسبت سے بھینسوں کی صحبت میں زندگی گزارتی ہیں۔

صمدو اڑیل بھینسا تھا۔ صبح چار بجے سے ہی لنگوٹ کس کر ڈنڈ بیٹھک میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اس نے شہر جا کر بڑے بڑے پہلوانوں کو پچھاڑا تھا۔ کتنی ہی بار بڑے بڑے کپ، شیلڈ اور نقد رقم جیت کر لایا تھا۔ نور بیگم بھی بھینسوں کی دیکھ بھال کے لئے صبح اٹھ جایا کرتی تھی۔ بھینسوں کے باڑے میں کام کرنے کے دوران اسے دیکھتی تھی اور سوچتی تھی۔ اتنا اونچا پورا دیو اس کا دولہا بن کر کیسا لگے گا؟ مجھے تو یہ اچھا بھی لگتا ہے اور اس سے ڈر بھی لگتا ہے۔ پتہ نہیں دولہا بن کر اور کیسی مار مارا کرے گا؟

وہ اپنے اکھاڑے سے گرج کر بولتا تھا۔ "اے اتنی دور سے گھور گھور کے نظر لگا رہی ہے۔ اگر اگلی کشتی ہار گیا تو تیرا کچومر نکال دوں گا۔"

وہ سر جھکا کر جلدی جلدی اپنا کام کرنے لگتی۔ اسے صمدو کی ڈانٹ ڈپٹ اچھی لگتی تھی۔ دراصل وہ بچپن ہی سے جھڑکیاں سننے کی عادی ہوگئی تھی۔ اس لئے صمدو اچھا لگتا تھا اور صمدو کی ماں کچھ زیادہ اچھی نہیں لگتی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ ماں کی طرح پیار و محبت سے پیش آتی تھی اور اسے اردو انگریزی کی کتابیں پڑھایا کرتی تھی۔

انگریزی کی دوسری اور اردو کی پانچویں کتاب ختم کرتے کرتے وہ بارہ برس کی ہوگئی۔ اتنی قد آور ہوگئی کہ صمدو کے سینے تک پہنچنے لگی۔ وہ اس سے عشق تو نہیں کرتا تھا لیکن اسے ایک بیوی کی ضرورت تھی، جو پچھلے چھ سال سے نہیں مل رہی تھی۔ وہ ایسا سیاہ فام اور ہیبت ناک پہلوان تھا کہ نازک اندام عورتیں اس کی پہلوانی سے اور

خوبصورت عورتیں اس کی بدصورتی سے گھبرا کر دور ہی سے کترا جاتی تھیں۔

اس بات نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔ عورتوں سے وہ بڑی نفرت کرتا تھا لیکن نفرت کے باوجود ایک بیوی لازمی تھی تاکہ وہ تمام عورتوں کا غصہ اس پر اتار سکے۔ جب اسے کوئی نہ ملی تو وہ آٹھ برس کی نور بیگم کو پال پوس کر جورو بنانے کے لئے اٹھا لایا۔ ماں نے اسے سمجھایا۔ "لڑکی زیادہ بدصورت نہیں ہے' صرف کالی ہے۔ اس سے محبت سے پیش آنا' نہیں تو کسی دن بھاگ جائے گی۔"

لیکن صمدو پہلے ہی دن سے اس پر غصہ اتارنے لگا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر اسے جھڑک دیتا تھا۔ کبھی کبھی دو چار ہاتھ جما دیتا تھا پہلے وہ روتی تھی' پھر تین وقت کے کھانے کی طرح مار کھانا بھی ایک معمول بن گیا تو وہ ڈھیٹ بن گئی۔ مار کھاتے ہی "اونہہ" کہہ کر ماں جی کے پاس بھاگ جاتی تھی۔

بارہ برس کی عمر میں وہ تگڑی عورتوں جیسی نظر آنے لگی تھی۔ صمدو نے چار برس کے دوران پہلوانی ہاتھ دکھا دکھا کر اس لڑکی کو پتھر بنا دیا تھا۔ اس کے بدن کی کھال اتنی موٹی اور سخت ہو گئی تھی کہ موسم سرما میں بھینسوں کی طرح اسے سردی نہیں لگتی تھی۔ جسمانی لحاظ سے وہ انسان نما بھینس تھی۔ جب وہ آنکھوں میں کاجل لگا کر صمدو کو دیکھ کر مسکراتی تو وہ طنز کرتا۔ "اری ایک تو کوے کی طرح کالی ہے' دوسرے کاجل لگاتی ہے۔ تجھے تو چونا قلعی کرانا چاہئے۔"

"میں کالی ہوں تو تُو کون سا گلفام ہے۔ یہ تو میں ہوں کہ تیرے پاس رہ گئی۔ کوئی گوری چمڑی والی تجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرے گی۔"

نور بیگم نے اسے پہلی بار ایسا طعنہ دیا تھا۔ اس روز صمدو نے اس کی خوب پٹائی کی۔ ماں گھر پر نہیں تھی۔ وہ مار سے بچنے کے لئے کمرے سے نکل کر بھاگتی ہوئی بھینسوں کے باڑے میں گئی۔ صمدو نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ "حرامزادی بچ کے کہاں جائے گی؟ آج میں تیرا کچومر نکال دوں گا۔"

وہ کبھی اس بھینس کے اور کبھی اس بھینس کے پیچھے بھاگتی رہی۔ صمدو بھینسوں کی رکاوٹیں پار کرتا رہا۔ پھر وہ بھاگتے ہوئے چارے کے ڈھیر پر جا گری۔ صمدو اسے گرفت میں لینے ہی والا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے پکڑتے پکڑتے وہ بھی اس کے ساتھ گر

پڑا۔ چارے کی سیج پر بے چاری کو دو چار زبردست ہاتھ پڑے۔ وہ مار سے بچنے کے لئے ایک دم سے لپٹ گئی۔ صمدو اس کمبل کو نوچ کر پھینک دینے کی کوشش میں اِدھر سے اُدھر لوٹ گیا۔ پھر اچانک ہی جیسے اسے بجلی کا جھٹکا پہنچا ہو' وہ یکبارگی تھم گیا۔ جہاں تھا' وہیں جم گیا۔ حیرانی سے نور بیگم کو یوں دیکھنے لگا جیسے پہلی بار کسی لڑکی کے دھوکے میں عورت کو سمجھ رہا ہو۔

وہ کالی کالی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے تک رہی تھی۔ اس سمے اس کی آنکھوں کے کاجل کی دھار صمدو کے دل میں اتر رہی تھی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "تُو............ تُو بہت اچھی لگ رہی ہے۔"

وہ انتظار میں تھی کہ وہ ابھی غصہ اتارے گا لیکن اس کے منہ سے پہلی بار اپنی تعریف سن کر وہ خوشی سے لرز گئی۔ پھر ایک بار وہی بات سننے کے لئے بولی۔ "چل ہٹ۔ جھوٹ بولتا ہے۔"

"ایمان سے کہتا ہوں تُو میرے دل میں گھسی آ رہی ہے۔ اتنی اچھی لگ رہی ہے کہ تجھے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔"

"ایسی میں کیا ہو گئی ہوں؟ کیا رنگ صاف ہو گیا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے دیکھا' رنگ تو ویسا ہی کالا تھا۔

اس نے پوچھا۔ "کیا میرا ناک نقشہ بدل گیا ہے؟"

"نہیں' جیسے پہلے تھی' ویسے ہی اب بھی ہے۔"

"پھر میں اچھی کیوں لگ رہی ہوں؟"

یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب صمدو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کوئی کسی کو اچھا کیوں لگتا ہے؟"

بارہ برس کی عمر میں وہ قد آور تو تھی مگر ایسی بھرپور نہیں تھی کہ اس کی جسمانی تبدیلیاں نگاہوں کو اچھی لگتیں۔ اس میں ایسی کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ پھر وہ اچھی کیوں لگ رہی تھی۔

اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ آدمی اپنی بھوک سے مجبور ہے اسے مہنگا کھانا نہیں ملتا تو سستا کھاتا ہے۔ سستا بھی نہ ملے تو باسی پر گزارا کر لیتا ہے اور اللہ کا شکر بھی

ادا کرتا ہے کہ اسے ایک نعمت عطا کی گئی ہے۔ اسے خوبصورتی کے مہنگے بازار سے خالی ہاتھ واپس آکر نور بیگم بہت بڑی نعمت لگ رہی تھی۔

یہ نفسیاتی باتیں ہیں' جو پہلوان کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھیں' اس کے دماغ میں پہلے دن سے یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ نور بیگم اس کی بیوی بنے گی۔ چار برس کے دوران وہ انجانے پن میں نور بیگم کا عادی بنتا گیا تھا۔ عادت عمر کے حساب سے پک رہی تھی اور بتدریج جوان ہوتی جا رہی تھی۔ اس لئے نور بیگم اچھی لگ رہی تھی۔

وہ بے بسی سے بولا۔ "پتہ نہیں کیوں اچھی لگ رہی ہے۔ میں اماں سے بولوں گا کہ اب ہماری شادی کرادیں۔"

نور بیگم خود کو ایک جھٹکے سے چھڑا کر الگ ہوئی۔ پھر شرما کر بھاگنے لگی۔ صمدو نے تڑپ کر آواز دی۔ "نوری!"

دور آنگن میں بھاگنے والی کے قدم رک گئے۔ زندگی میں پہلی بار اسے پیار سے نوری کہہ کر پکارا گیا تھا۔ کیسا سریلا نام تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ صمدو کے ہونٹوں پر وہ نام ایک سنگیت بن جائے گا۔ نوری نے ذرا جھوم کر ذرا گھوم کر اس پہلوان سنگیت کار کو دیکھا اور پھر ایک بار شرما کر وہاں سے بھاگتی ہوئی ایک کمرے میں گھس گئی۔

شام کو صمدو نے روٹی کھاتے وقت ماں سے کہا۔ "اماں! نوری بالکل تیار ہو گئی ہے۔"

ماں نے پوچھا۔ "تُو نے کس بات کے لئے اسے تیار کیا ہے؟"

"میں نے نہیں' اللہ کی قدرت نے تیار کیا ہے۔"

"کیا بک رہا ہے؟"

"اماں! میں کیسے سمجھاؤں۔ اللہ میاں جیسے درختوں میں پھل تیار کرتے ہیں' ویسے ہی نوری کو شادی کے لئے تیار کر دیا ہے۔"

ماں نے حیرانی سے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ "تجھے کیسے معلوم ہوا کہ وہ شادی کے قابل ہو گئی ہے؟"

"میں کیا بتاؤں؟ بس اندازہ کیا ہے۔"

"ارے تیری کھوپڑی میں تو پہلوانوں کے داؤ پیچ ہوتے ہیں تُو عورت کو کب سے سمجھنے لگا؟"

"اماں! اب میں ایسا نادان بھی نہیں ہوں۔ لڑکی شرمانے لگے تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ تیار ہے۔"

"چولہے میں گئی تیری تیاری۔ کمبخت تجھے بولنا بھی نہیں آتا ہے۔ خبردار آئندہ کبھی ایسی باتیں نہ کرنا۔ میں تجھ سے زیادہ جانتی ہوں۔ ابھی وہ بچی ہے۔ تین چار برس کے بعد شادی کے قابل ہو گی۔"

"تین چار برس؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں۔ چھوٹی عمر میں شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے سے اس کی صحت خراب ہو جائے گی۔ بچے بھی روگی پیدا ہوں گے۔ تُو کچھ پڑھا لکھا ہوتا تو یہ باتیں تیری سمجھ میں آتیں۔ بس اب مجھ سے بحث نہ کرو۔"

اس دن ماں نے اسے قیامت کے انتظار میں مبتلا کر دیا۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ جو چیز ہمارے ہاتھ نہیں آتی ہم اس کے لئے للچاتے ہیں۔ ماں نے نوری کو اس کی نگاہوں کے سامنے رکھا تھا۔ مگر اس سے دور رکھا تھا۔ اس لئے صمدو کی نگاہوں میں نوری کی قدر و قیمت آپ ہی آپ بڑھنے لگی تھی۔

نوری کمرے میں تنہا کام کرتی رہتی تو ماں صمدو کو اس کمرے میں جانے نہیں دیتی تھی۔ رات کے وقت نوری کو اپنے پاس سلاتی تھی۔ کسی کام سے باہر جاتی تو اسے ساتھ لے جاتی۔ ان باتوں نے پہلوان کو عشقیہ ہتھکنڈے سکھا دیئے۔ وہ ماں کی نظریں بچا کر نوری کو اشارے کرتا تھا۔ کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے آکر اسے دیکھتا تھا۔ جیسے جیسے عمر کروٹیں بدل رہی تھی' ویسے ویسے صمدو کی نگاہوں کی آنچ سے نوری کا بدن تپ رہا تھا۔ نگاہوں کی انگلیاں بڑی شریر ہوتی ہیں۔ دنیا کو خبر نہیں ہوتی اور وہ چھیڑتی چلی جاتی ہیں۔ اسی چھیڑ چھاڑ میں وہ پندرہ برس کی ہو گئی۔

ایسی کچی عمر میں لڑکیوں کا ذہن بڑا پکا ہوتا ہے۔ اس عمر میں وہ ایک ایک لمحے کو یاد رکھتی ہیں' جو اپنے چاہنے والوں کی چھیڑ چھاڑ سے گزرتے ہیں۔ ان کوری کنواریوں کی یادداشت میں پہلی چاہت کے واقعات نقشِ اول بھی ہوتے ہیں اور نقشِ

آخر بھی۔ صمدو صرف اپنی لگی جانتا تھا۔ یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ کس طرح نوری کی رگ رگ میں اتر چکا ہے۔

ماں چوبیس گھنٹے پہرے دار بن کر نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک بار یوں ہوا کہ صمدو علی الصبح شہر چلا گیا۔ ماں جانتی تھی کہ شام سے پہلے اس کی واپسی نہیں ہوگی۔ لہٰذا وہ مطمئن ہو کر اپنے دور کے رشتے داروں کے ہاں چلی گئی۔ نوری کو بھینسوں کی دیکھ بھال کے لئے چھوڑ گئی۔ ماں کی واپسی دوپہر سے پہلے ممکن نہیں تھی۔ کیونکہ ان رشتہ داروں کے ہاں کسی لڑکی کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ گھر میں تنہا رہ جانے والی اپنے کام میں لگ گئی۔

صبح سے شام تک بہت سارے کام ہوتے تھے' بھینسوں کو نہلانا' ان کے لئے چارہ تیار کرنا' کھانا پکانا' برتن مانجھنا' کپڑے دھونا۔ گھر کی ایک ایک چیز کو جھاڑتے پونچھتے رہنا۔ غرض یہ کہ صبح سے رات ہو جاتی تھی اور کام جاری ہی رہتا تھا مگر اسے پتہ نہیں چلتا تھا کہ سارے کام کیسے نمٹ جاتے ہیں؟ اس کے تصور میں ہر لحہ صمدو رہتا تھا جیسے وہ طلسمی چراغ کا دیو تھا۔ اس کے دماغ میں رچ بس کر سارے کام آسان کر دیتا تھا۔

اس روز وہ پہلی بار گھر میں تنہا رہی۔ اسے عجیب سے لگا۔ وہ ماں جی اور صمدو کی عادی ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا کاش وہ شہر نہ جاتا کاش وہ راستے سے واپس آجائے وہ بڑی حسرت سے دعائیں مانگنے کے انداز میں سوچتی رہی کہ بس وہ آہی جائے۔ نہیں تو یہ تنہائی اسے مار ڈالے گی۔

اور وہ آگیا۔ اسے اچانک دیکھتے ہی نوری کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ عجیب بات تھی کہ وہ اس مرد سے ڈرتی بھی تھی اور اس پر مرتی بھی تھی۔ وہ اسے خیالوں میں پکارتی پھر رہی تھی۔ جب وہ آگیا تو اسے دیکھتے ہی چولہے کے پاس بیٹھے بیٹھے سمٹ گئی۔ ذرا خوش ہو کر ذرا سہم کر بولی۔ "تو شہر گیا تھا؟"

"اماں کو چکر دینے راوی تک گیا تھا۔"

نوری نے سر کو جھکا لیا۔ اتنا تو سمجھتی ہی تھی کہ یہ چکر بازی اس کے لئے ہے۔ عورت خوش ہوتی ہے جب کوئی اسے چاہتا ہے۔ اس کے لئے چکر چلاتا ہے اس کے

لئے جھوٹ بولتا ہے اور دنیا کو دھوکے دیتا ہے۔ اگر ابتدا سے حساب کیا جائے تو مرد اب تک عورت کے لئے سب سے زیادہ جھوٹ بولتا آیا ہے۔ اگر وہ نوری کے قدموں میں سارے جہاں کی دولت لا کر ڈال دیتا تو وہ اتنا خوش نہ ہوتی جتنا کہ اس کی خاطر ماں سے جھوٹ بولنے پر ہو رہی تھی۔ عورتوں کی نفسیاتی ہسٹری یہی ہے۔

وہ قریب آ کر بیٹھ گیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ صمدو بھی اٹھ کر کھڑا ہوا۔ وہ ہرنی کی طرح بدک کر دور ہو گئی۔ اس نے قریب آ کر ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی کمرے کے اندر چلی گئی۔ صمدو بھی اس کے پیچھے کمرے میں گھس گیا۔ یہ سب کچھ بڑی خاموشی سے ہوتا رہا تھا۔ بعض حالات میں کچھ کہنا ضروری نہیں ہوتا۔

باورچی خانہ خالی ہو گیا تھا۔ چولہے پر ہانڈی چڑھی ہوئی تھی' اور چولھا اسے پکار رہا تھا۔ پکنے کا عمل یہ ہوتا ہے کہ پہلے ہانڈی کا بدن گرم ہوتا ہے پھر اس کے اندر آنچ پہنچتی ہے۔ قریب رہنے والا ہانڈی سے اٹھنے والی سنسناہٹ کو سن سکتا ہے۔ پانی زیادہ ہو تو حرارت سے بلبلے اٹھنے اور پھوٹنے لگتے ہیں۔ اسی انداز میں وہ ہانڈی آہستہ آہستہ پکتے پکتے ابل پڑی۔ نوری اسے چولہے پر سے اتارنے نہ آسکی۔ ہانڈی سے ابل کر گرنے والے پانی نے آپ ہی چولہے کو ٹھنڈا کر دیا۔

دوپہر کو ماں واپس آئی تو صمدو وہاں سے جا چکا تھا۔ نوری کچھ بیمار سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ ماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا ہوا بیٹی! طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

نوری کا انگ انگ مسکرا رہا تھا۔ چہرے کی زردی عارضی سی تھی۔ وہ مسکرا کر بولی۔ "ٹھیک ہوں۔ بالکل ٹھیک ہوں ماں جی!"

بھید کھل نہ جائے' اس لئے وہ ماں کے پاس سے ہٹ گئی۔ کمرے میں جا کر بستر پر گر پڑی اس کے دل کی دھڑکنوں میں اس کی سانسوں میں اور اس کی سوچ میں صمدو ہی صمدو بسا ہوا تھا۔ اس کے سوا اور کچھ سوچنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اب ایک ہی تمنا تھی کہ ماں پھر چلی جائے۔ صمدو پھر آجائے۔

اس دن سے صمدو نوری کا دیوانہ بن کر رہ گیا تھا۔ اس نے پھر ماں سے ضد کی۔

"اماں! اب نوری سے شادی ہو جانی چاہئے۔"

"تو شادی کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔ پہلے تو صرف پہلوانی کی دھن میں رہتا تھا اب شادی کی دھن سوار ہے۔ اب کے میلے میں شیدا پہلوان سے مقابلہ ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تو ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ کیا کشتی ہارنے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں' میں تو صبح و شام چار پہلوانوں سے زور کرتا ہوں۔ تیرے بیٹے کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ بس تو شادی کرا دے۔"

"میلہ لُوٹ کے آئے گا' تب شادی ہو گی۔"

"اس کے لئے تو آٹھ مہینے باقی ہیں۔"

"تو کیا ہوا؟ نوری بھاگی نہیں جا رہی ہے۔"

صمدو کا جی چاہتا تھا کہ نوری کو بھگا کر لے جائے۔ آٹھ ماہ تک وہ نوری کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور ماں اپنا فیصلہ بدلنے والی نہیں تھی۔ وہ کئی دنوں تک دور ہی دور سے نوری کو اشارے کرتا رہا۔ راتوں کو آہستہ سے اٹھ کر ماں کے کمرے میں جھانکتا تھا۔ نوری ماں کے برابر دوسری چارپائی پر سوتی تھی بلکہ وہ بھی جاگتی رہتی تھی۔ صمدو اسے اٹھ کر آنے کے لئے اشارے کرتا تھا لیکن ماں کی نیند بڑی کچی تھی چارپائی پر اٹھنے بیٹھنے کی ہلکی سی آواز بھی ہوتی تو بوڑھی عورت کی آنکھ کھل جاتی تھی۔

وقت پر سونے جاگنے اور ورزش کرنے کے معمول میں فرق آ گیا تھا۔ وہ راتوں کو جاگتا تھا اور دن کو سوتا تھا۔ ماں اسے برا بھلا کہتی رہتی تھی۔ اس کے ایک شاگرد نے کہا۔ "استاد یہی حال رہا تو تم کشتی نہیں جیت سکو گے۔"

"مجھے نوری مل جائے گی تو میں کشتی جیت لوں گا۔"

بہت سوچ بچار کے بعد شاگرد نے مشورہ دیا۔ "ہمارے ہاں کے ڈاکٹر کے پاس نیند لانے والی دوائیں ہیں۔ ماں کو وہ دوا کھلا دیا کرو صبح تک راستہ صاف رہے گا۔"

صمدو نے ایسا ہی کیا۔ ڈاکٹر کے پاس سے خواب آور گولیاں لا کر ان کا سفوف تیار کیا۔ ماں دودھ نہیں پیا کرتی تھی۔ اس رات اس نے ضد کی۔ "اماں! اب میں تجھے اپنے ہاتھ سے دودھ پلایا کروں گا۔ تیری صحت گرتی جا رہی ہے۔"

"یہ اچانک تجھے میری صحت کا خیال کیسے آ گیا؟ اور تو جانتا ہے کہ میں دودھ نہیں پیتی۔"

"میری خوشی کے لئے تو زہر بھی پی سکتی ہے۔"

"اے خوشی کا ہے کی۔ کچھ معلوم تو ہو؟"

"جس طرح ماں بچوں کو کھاتا پیتا دیکھ کر خوش ہوتی ہے' اسی طرح بچے بھی ماں کو کھلا پلا کر خوش ہوتے ہیں۔ بس اب پی جا........."

ماں نے دودھ سے بھرا ہوا گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر اپنے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے روٹی کھا لینے دے اس کے بعد پی لوں گی۔"

اسی وقت اس کے شاگرد اس سے ملنے آئے۔ وہ ان سے ملنے کے لئے باہر گیا۔ شہر سے شیدا پہلوان کا ایک پروموٹر آیا تھا۔ سلام کلام کے بعد اس نے صمد سے کہا۔

"پہلوان! ہمارا شیدا پہلوان نورا کشتی لڑنا چاہتا ہے۔ یعنی کشتی سے پہلے طے ہو جانا چاہئے کہ کون جیتنا چاہتا ہے اور کون ہارنا۔"

صمدو نے کہا۔ "یہ تو میں نے پہلے سے سنا ہے کہ شیدا ایمانداری سے کبھی جیت نہیں سکتا۔ اس نے آج تک نورا کشتی لڑتے ہوئے اتنی شہرت حاصل کی ہے۔ میں اس کی جھوٹی شہرت کو خاک میں ملا دوں گا۔"

پروموٹر نے کہا۔ "تم اس کے بارے میں ایسا کہتے ہو' اور وہ تمہیں اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ تم بھائی بن کر رہو گے تو تمہیں بہت فائدہ پہنچے گا۔"

کیسا فائدہ؟"

"دیکھو' جیتنے والے کو پچاس ہزار روپے دیئے جائیں گے شیدا کشتی سے پہلے اپنے پلے سے تمہیں پچاس ہزار دے دے گا۔ کشتی میں ہار جیت ہوتی ہی رہتی ہے۔ اس بار تم ہار جانا۔"

"اے بکواس مت کرو۔ ہار گیا تو اماں مجھے گھر میں گھسنے نہیں دے گی۔ میں نوری کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ جاؤ یہاں سے' یہ سودے بازی مجھ سے نہیں چلے گی۔ شیدا سے کہو کہ مردوں کی طرح مقابلہ کرے' یا پھر مقابلہ ملتوی کرا دے۔ اسی میں اس کی بھلائی ہے۔"

اس نے کھرا جواب دے کر پروموٹر کو رخصت کر دیا۔ پروموٹر نے وہاں سے دور جانے کے بعد پلٹ کر اس کے گھر کی سمت دیکھا اور اپنے ایک حواری سے پوچھا۔ "یہ

نوری کون ہے' جسے یہ صمدو فاتح بن کر منہ دکھانا چاہتا ہے؟"

حواری نے جواب دیا۔ "ایک کالی بھجنگ سی لڑکی ہے یہ پہلوان اس کا دیوانہ ہے۔ اگر کوئی گوری خوبصورت محبوبہ ہوتی تو پتہ نہیں کیا کرتا؟"

دوسرے حواری نے کہا۔ "بھلا کون حسین عورت اس ہیبت ناک پہلوان سے عشق کرنے کی حماقت کرے گی۔ اگر کرے گی تو یہ خوشی سے مرجائے گا۔"

"ہوں۔" پروموٹر نے ایک لمبی ہوں کے ساتھ کہا۔ "یہ خوشی سے ہی مرے گا۔"

وہ سب فیصلہ کن انداز میں وہاں سے چلے گئے۔ صمدو کی دیوانگی ایسی تھی کہ دبی زبان سے اس کا چرچا دور دور تک پھیل رہا تھا لیکن یہ چرچا بدنام کرنے کے لئے نہیں تھا۔ ان دونوں کی شادی ہونے والی تھی۔ بھلا بدنامی کیا ہوتی؟ صمدو نے رات دس بجے سے نوری کے کمرے میں تاک جھانک شروع کردی تھی۔ ماں گیارہ بجے تک جاگتی رہی پھر آنکھیں بند کرکے سوگئی۔ نوری بھی سوگئی تھی۔ صمدو بے چینی سے انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ آنکھ کھول کر دیکھے گی لیکن وہ بے حسی کا مظاہرہ کرتی رہی۔

بارہ بجے اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بلی کی آواز نکالی۔ خیال تھا کہ وہ آنکھ کھول کر کھڑکی کی طرف دیکھے گی۔ اس نے دوسری بار پھر بلی کی آواز نکالی۔ ماں نے نیند میں کسمسا کر کہا۔ "ہشت۔ مردار بھاگ یہاں سے.........."

یہ کہہ کر وہ پھر گہری نیند میں ڈوب گئی۔ صمدو پھر گھنٹے بھر تک اس الجھن میں رہا ماں سوچکی ہے یا آنکھیں بند کئے جاگ رہی ہے۔ اس نے ایک چھوٹا سا کنکر اٹھا کر تاک کر مارا۔ نشانہ درست رہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس کے دل میں آیا کہ کھڑکی پر ایک گھونسہ رسید کرے۔ چوری کی نیت سے آنے والے غصہ نہیں دکھاسکتے۔ اس لئے اس نے غصہ کو ضبط کرلیا۔

رات کے ایک بجے وہ ہمت کرکے اس کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس کا پہلوان دل اماں کے ڈر سے دھک دھک کررہا تھا۔ خواہشات اس کے خوف کو دبا رہی تھیں۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا آہستہ آہستہ سانس لیتا ہوا نوری کی چارپائی کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے سونے والی کو ہولے سے جھنجھوڑا۔ مگر اس نے آنکھ

نہیں کھولی۔ وہ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے سوچنے لگا کیا کرے؟ کمرے میں گھس آیا تھا۔ اماں کی بیداری کا اندیشہ تھا اور وہ خالی ہاتھ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔

وہ نوری پر جھک گیا۔ بڑی آہستگی سے اس نے اسے دونوں بازوؤں میں پھولوں بھری ٹہنی کی طرح اٹھالیا۔ یہ پہاڑ تھا' وہ تنکا تھی۔ پہاڑ کی ہتھیلی پر وہ کس طرح چارپائی سے بلند ہوئی اور کیسے کمرے سے باہر آئی' اسے خبر نہ ہوئی۔ وہ نیند کی مستی میں ڈوبی رہی اسے چرا کر لانے والے نے پہلے سوچا کہ اپنے کمرے میں لے جاکر اسے نیند سے جگائے لیکن پاس والا کمرہ ماں کا تھا' وہ جاگ جاتی لہٰذا وہ اسے اٹھائے ہوئے مکان کے سامنے احاطے میں آیا وہ کھلی جگہ تھی اس لئے وہ بھینسوں کے باڑے میں اسے لے آیا۔ پھر چارے کے ڈھیر پر اسے پھینکتے ہوئے بولا۔ "سالی نے قیامت تک سونے کی قسم کھالی ہے۔"

وہ چارے پر اوندھے منہ پڑی رہی۔ صمدو نے جھک کر اسے سیدھا کیا۔ وہ چاروں شانے چت ہوگئی۔ اس نے پاس بیٹھ کر اسے جھنجھوڑنا اور ہولے ہولے پکارنا شروع کیا۔ کبھی غصہ بھی دکھایا۔ ایک ہلکا سا طمانچہ بھی رسید کیا۔ وہ پہلوان اس پہلو سے نہیں سوچ رہا تھا کہ نوری نے اماں کے حصے کا دودھ پی لیا ہوگا۔

وہ تھک ہار کر اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔ "نوری اٹھ جا اری کیوں تڑپا رہی ہے۔"

اس نے جھک کر اسے پیار کیا۔ نوری نے ذرا بھی حرکت نہ کی۔ صمدو کو ڈر لگا۔ "ارے تُو تو ہلتی بھی نہیں ہے کہیں مر تو نہیں گئی؟"

وہ اس کے برابر لیٹ گیا۔ اس کے سینے پر کان رکھ کر سننے لگا۔ سونے والی کا دل ہولے ہولے دھڑک رہا تھا۔ وہ زندہ تھی۔ ڈرنے کی بات نہیں تھی۔ سوچنے کی بات تھی کہ وہ اتنی گہری نیند کیوں سو رہی ہے۔ اس کی بات کا جواب بھی نہیں دے رہی تھی۔ زبردستی چھیڑو تو کراہنے لگتی تھی۔ صمدو کو یقین تھا کہ جس دودھ میں خواب آور دوا ملائی گئی تھی اسے ماں نے پیا ہے' جس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہی تھی۔

بوڑھی ماں اپنی عادت کے مطابق کچی نیند سو رہی تھی۔ نوری کی چارپائی ذرا بھی

کراہتی تو ماں کی آنکھ کھل جاتی۔ صمدو اسے تنکے کی طرح اٹھا کر لے گیا تھا۔ چارپائی کو احتجاج کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اس لئے ماں سو رہی تھی اور صمدو خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ اس نے ظالم سماج کو گہری نیند سلا دیا ہے۔

صبح چار بجے تک وہ خوابیدہ شباب کے کبھی پاؤں پڑتا رہا، کبھی ہاتھ جوڑتا رہا۔ اسے نیند سے جگانے کے لئے پیار بھرے منتر پڑھتا رہا۔ تمام بھینسیں خاموش کھڑی اس کی بے بسی کا تماشہ دیکھتی رہیں۔ نوری سے تمام رات محبت کرنے کے لئے اس نے کتنے پاپڑ بیلے تھے۔ ساری محنت اکارت گئی تھی۔ اب صبح ہونے والی تھی۔ اسے واپس چارپائی پر لے جا کر ڈالنا ضروری تھا۔ اس نے غصہ میں اسے ایک الوداعی طمانچہ رسید کیا۔ نوری نے نیند میں رونے والی آواز نکالی۔ پھر سو گئی۔ وہ اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر واپس کمرے میں لے آیا۔

ایسے ہی موقع پر کہتے ہیں۔ "حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔" وہ نوری کو بستر پر چھوڑ کر کمرے سے باہر آیا تو اس کا غنچۂ آرزو مرجھا چکا تھا۔ اکھاڑے میں جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ مگر وہ نڈھال سا ہو کر برآمدے میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ نوری سے کہہ رہی تھی کہ روز صبح خود ہی اٹھ جاتی ہے آج ابھی تک کیوں پڑی سو رہی ہے؟

نوری کا جواب نہیں سنائی دے رہا تھا۔ ماں کی آوازوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اسے جھنجھوڑ بھی رہی ہے۔ پھر وہ صمدو کو آوازیں دیتی ہوئی باہر آئی اسے دیکھ کر بولی۔

"تو یہاں بیٹھا ہے۔ اکھاڑے میں کیوں نہیں گیا؟"

"دل نہیں چاہتا۔"

"تیرا دل چاہتا کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ یہ بتا مجھے کیوں پکار رہی تھی؟"

"ارے ہاں، وہ نوری کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے؟ ایک دم بے ہوشی کی نیند سو رہی ہے۔"

وہ چڑ کر بولا۔ "مر گئی ہو گی۔"

"مریں اس کے دشمن۔ تو ایسا چڑچڑا کیوں ہو گیا ہے؟"

وہ وہاں سے اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوا اکھاڑے کی طرف چلا گیا۔ اکھاڑے میں اس کے سات پٹھے ڈنڈ بیٹھک میں مصروف تھے۔ وہ ایک طرف سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اس کے رازدار پٹھے نے پاس آکر پوچھا۔ "کیا ہوا استاد! کام نہیں بنا کیا؟"

وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ "سالا اپنا مقدر ہی خراب ہے۔ ماں کو دوا کھلائی تھی مگر نوری ابھی تک سو رہی ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ضرور تم نے کوئی گڑبڑ کی ہے۔ ماں نے تمہارے سامنے وہ دوا پی تھی۔"

"نہیں، میں پروموٹر سے باتیں کرنے آیا تھا۔ واپس گیا تو دودھ کا گلاس خالی ہو چکا تھا۔"

"پھر تو تمہاری ماں نے نوری کو وہ دودھ پلایا ہو گا۔ تم نے کہا تھا کہ اماں دودھ کبھی نہیں پیتی ہیں۔"

صمدو اپنی کھوپڑی سہلاتے ہوئے اب اس پہلو پر غور کرنے لگا اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ پہلے کیوں نہیں غور کیا۔ خواہ مخواہ بے چاری کو کئی طمانچے مار دیئے۔ اس کا دل اس مظلوم کے لئے محبت سے بھر گیا۔ جی میں آیا کہ دوڑ کے جائے اور اس سونے والی کو کلیجے سے لگا لے۔ شاگرد نے پوچھا۔ "دودھ میں ایک ہی گولی ملائی تھی نا؟"

"نہیں، میں نے سوچا ایک گولی سے اماں صبح تک نہیں سوئے گی۔ رات کو کسی وقت جاگ گئی تو مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ میں نے دو گولیوں کا سفوف بنایا مگر اطمینان نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ گولیاں دال کے دانے کے برابر چھوٹی چھوٹی سی تھیں۔ بھلا کچی نیند سونے والی کو گہری نیند کیا سلاتیں۔ اس لئے میں نے تین گولیوں کا سفوف بنا کر دودھ میں حل کیا تھا۔"

"ارے مار ڈالا استاد تم نے۔ اگر ماں وہ دودھ پی لیتیں، تو قیامت تک سوتی رہ جاتیں۔ تمہاری نوری کی صحت اچھی ہے وہ بچ تو جائے گی مگر خدا کے لئے پھر کبھی نیم حکیم نہ بننا۔ نہیں تو کسی کی جان لے کر رہو گے۔"

☆------☆------☆

نوری کی زندگی تھی اس لئے زندہ رہ گئی۔ اس واقعہ کے بعد دونوں کے دل میں

ایک دوسرے کی محبت اور شدید ہو گئی۔ اب ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکیں گے لیکن ابھی عشق کے امتحاں اور بھی تھے۔ ان امتحانات کے بعد ہی اس کے دعوے کی صداقت کو سمجھا جا سکتا تھا۔

ایک صبح وہ اکھاڑے میں ورزش کر رہا تھا کہ دس گز کے فاصلے پر سامنے والے مکان کا دروازہ کھلا نظر آیا۔ وہاں ایک بے حد حسین عورت کھڑی ہوئی تھی۔ گورا گورا رنگ' کالی کالی آنکھیں' لانبے لانبے بال' اونچا پورا قد اور بھرا بھرا بدن دیکھ کر صمدو بیٹھک لگاتے لگاتے بیٹھ گیا۔ اپنے شاگرد سے پوچھا۔ "یہ کون ہے رے۔ پہلے تو کبھی نظر نہیں آئی؟"

"استاد! شہر والی لگتی ہے۔ کیسے جم کے دروازے پر کھڑی ہے۔ شرماتی بھی نہیں ہے۔"

صمدو نے اُدھر سے منہ پھیر کر کہا۔ "آؤ زور لگائیں۔"

وہ اپنے چار پٹھوں کے ساتھ اکھاڑے میں اتر گیا۔ زور آزمائی کا تماشا بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ ایک پہلوان کو اس کے شاگرد متحد ہو کر گرانے کی کوشش کرتے ہیں اور پہلوان مضبوط چٹان کی طرح جم کر شاگردوں کے داؤ پیچ سے بچتا ہے اور اپنے داؤ پیچ آزما کر انہیں گراتا یا دور پھینکتا رہتا ہے۔ صمدو نے زور آزمائی کے دوران دیکھا۔ وہ شہر والی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اکھاڑے کی حد بندی تک آ گئی تھی اور بڑی حیرت اور مسرت سے وہ تماشا دیکھ رہی تھی۔

ایک بار صمدو سے اس کی نظریں ٹکرائیں۔ وہ فوراً ہی داؤ پیچ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دوسری بار نظریں ملتے ہی وہ مسکرائی۔ صمدو کے قدم اکھڑ گئے' شاگردوں نے اسے گرا دیا۔ وہ حسین عورت کے سامنے گرنے والی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فوراً ہی سنبھل کر ایسے داؤ استعمال کئے کہ شاگرد اِدھر اُدھر گرتے چلے گئے۔ وہ شہر والی خوش ہو کر تالیاں بجانے لگی۔

وہ سب زور آزمائی بھول کر اس کی تالیاں سننے لگے۔ گاؤں میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ.......... کسی عورت نے پہلوانوں کی ٹولی پر آ کر اس طرح مسرت کا اظہار کیا ہو۔ وہ صمدو کو ایسے دیکھے جا رہی تھی جیسے وہاں اور کوئی چیز دیکھنے کی نہ ہو۔ اس نے

کہا۔ "سوری! مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے۔ سنا ہے اکھاڑے میں عورتوں کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے۔ کیا میں چلی جاؤں؟"

سب اسے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے پہلی بار عورت کو دیکھ رہے ہوں۔ ان پہلوانوں نے آفات سے اور خصوصاً عورتوں سے بچ کر رہنے کے لئے اپنے گلے میں یا بازوؤں میں تعویذ باندھ رکھے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی لنگوٹ اتارے بغیر اپنے اپنے لباس پہن لئے۔ تاکہ ان کے کسرتی بدن کو نظر نہ لگے۔ اگر کوئی گاؤں کی عورت ادھر سے گزرتی تو وہ لوگ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتے۔ مگر اس شہر والی سے سب ہی متاثر ہو گئے تھے۔

وہ بولی۔ "میری وجہ سے تم لوگ اپنا اکھاڑہ چھوڑ رہے ہو۔ میں چلی جاتی ہوں۔ مگر پہلوان جی! میں اکیلے میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

صمدو کے اندر عجیب سی ہلچل مچ گئی۔ اتنی حسین عورت' وہ بھی شہر والی' اس سے تنہائی میں پتہ نہیں کیا کہے گی؟ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے کتنی ہی حسین عورتوں کو دل میں بسانا چاہا تھا مگر سب نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ اس نے اپنے شاگردوں کو وہاں سے رخصت کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد وہ بولی۔ "میں شہر کے ہنگاموں سے گھبرا کر یہاں آتی ہوں' کل واپس چلی جاؤں گی۔ یہ سامنے مکان والوں نے مجھے دو دن کے لئے مہمان بنا رکھا ہے۔ ہم پڑھے لکھے شہر کے رہنے والے دل کی بات نہیں چھپاتے۔ میں بھی نہیں چھپاؤں گی۔ سچ بولنے میں شرم کیسی؟ تمہیں دیکھنے کے بعد یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا ہے۔"

صمدو کا منہ حیرانی سے کھل گیا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ بولا۔ "یہ سب آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"آپ نہیں' مجھے تم کہو۔"

"اچھا۔ مگر میں تو کالا ہوں۔ صورت بھی اچھی نہیں ہے' تم میرا مذاق تو نہیں اُڑا رہی ہو؟"

"میں مذاق اُڑانے والوں پر لعنت بھیجتی ہوں۔ بے شک تم کالے ہو مگر عورت رنگ اور صورت نہیں دیکھتی ہے۔ یہ پہاڑ جیسا قد' چٹان جیسا سینہ' فولاد جیسے بازو۔

ہائے ابھی تم ان پہلوانوں کو کیسے اٹھا اٹھا کر پھینک رہے تھے۔ ایسا طاقتور آدمی میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔ میں بتا نہیں سکتی کہ تمہیں دیکھ کر میرے دل میں کیا ہو رہا ہے۔"

اس کے دل کا حال وہ جانتی ہوگی۔ صمدو کے سینے میں اپنا دل الٹ پلٹ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ محبت بھری باتوں کے جواب میں کس طرح محبت بھرے مکالمے ادا کرے۔ وہ بولی۔ "تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ دستور ہے کہ کسی سے محبت ہو جائے تو اس کے منہ پر کہہ دیتے ہیں۔ پھر وہ محبت کرنے والے ملتے رہتے ہیں تاکہ ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھتے رہیں۔ ایک دوسرے کو آزماتے رہیں۔ جب آزمائش پوری ہو جاتی ہے تو پھر شادی ہو جاتی ہے۔ میں بھی کتنی نادان ہوں۔ یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ تمہارا نام کیا ہے؟ میرا نام شازیہ ہے۔"

"میرا نام عبدل صمد خان ہے لوگ مجھے صمدو کہتے ہیں۔"

"میں بھی صمدو کہوں گی ہائے کتنا پیارا نام ہے۔"

"تمہارا نام بھی بہوتا چھا ہے۔" وہ زندگی میں پہلی بار کسی حسین عورت کی تعریف کرتے وقت ہانپنے لگا۔

اس نے پوچھا۔ "میں تم سے ملنے تمہارے گھر آؤں؟"

"آؤ۔ ہاں ضرور۔ مگر اماں کو سمجھانا ہوگا۔" وہ ابھی تک ہانپ رہا تھا۔

"میں سمجھا دوں گی۔ تمہاری اماں سے بولوں گی کہ اخبار میں تمہارا انٹرویو شائع کرانے آئی ہوں۔"

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔ پچھلے سال کشتی جیتنے پر اخبار میں میری ایک چھوٹی سی تصویر اور انٹرویو چھپا تھا۔ پھر تو اماں تم سے مل کے بہت خوش ہوگی۔"

"اچھا میں جاتی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد آؤں گی۔"

شازیہ نے قربان ہو جانے والی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ پھر پلٹ کر وہاں سے جانے لگی۔ وہ ایسے مٹک کر چل رہی تھی کہ صمدو کی نگاہیں اِدھر سے اُدھر ہونے والے کولہوں پر جم گئی تھیں۔ اس نے شہر میں ایسی چال چلنے والیوں کو دیکھا تھا مگر شازیہ تو گاؤں میں آ کر اس کے سینے پر قدم رکھ رکھ کر چل رہی تھی۔ سامنے والے مکان کے دروازے پر پہنچ کر اس نے صمدو کو پلٹ کر دیکھا۔ اپنے سانسوں بھرے سینے

پر ہاتھ رکھ کر ہائے کے انداز میں سانس لی۔ پھر مکان کے اندر چلی گئی۔

صمدو کی تو کھوپڑی گھوم کر رہ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے پاؤں زمین پر نہیں ہیں۔ آسمان مہربان ہو گیا تھا۔ اتنی بڑی خوش بختی کی تو وہ توقع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ شہر سے ایکسپورٹ ہو کر آنے والا سارا کا سارا شباب اس کی ملکیت ہونا چاہے گا۔ شازیہ کی مسکراہٹ اس کی چال' اس کی ادائیں اور پیار بھری نگاہیں سب پہلوان کے لئے تھیں۔ پہلوان یہ سوچ سوچ کر خوشی سے پاگل ہو رہا تھا۔

وہ اپنے گھر کی طرف تیزی سے جانے لگا۔ گھر چار قدم کے فاصلے پر تھا۔ نوری اسے یہ خوش خبری سنانا چاہتی تھی کہ ماں گھر پر نہیں ہے۔ حکیم صاحب کا بچہ مر گیا ہے وہاں گئی ہوئی ہے۔ راستہ بالکل صاف ہے لیکن صمدو گھر میں داخل ہوتے ہی اسے گرما گرم نظروں سے دیکھنا بھول گیا۔ اس نے ماں کو پوچھا۔

نوری نے اپنی دانست میں وہی خوشخبری سنائی۔ صمدو نے کہا۔ "وہ نہ سہی۔ چل تُو جلدی سے بستروں پر چادریں اور تکیے کے غلاف بدل دے۔ گھر کی ایک ایک چیز کو سلیقے سے رکھ دے' وہ آنے والی ہے۔"

"کون آنے والی ہے۔"

وہ فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ صمدو نے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھا کر کھڑا کرتے ہوئے کہا۔ "بحث نہ کر' جو کہتا ہوں جلدی جلدی کرتی جا۔"

وہ جلدی جلدی احکام کی تعمیل کرنے لگی۔ سوچنے لگی۔ پتہ نہیں آج یہ کس دھن میں ہے۔ وہ بستر پر چادر بچھاتے ہوئے بولی۔ "اماں ایک گھنٹے سے پہلے نہیں آئے گی۔"

وہ اس کے دل میں بھولی ہوئی خواہش یاد دلانا چاہتی تھی۔ صمدو نے کہا۔ "ماں نہیں آئے گی تو تُو ناشتہ اور لسی لا کر رکھ دینا۔"

نوری نے پھر بات سے بات نکالی۔ "ہاں لسی کی بات پر یاد آیا۔ اُس روز تُو نے دھوکے سے نشے والا دودھ پلا دیا تھا۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ آخر تُو اماں کو وہ دودھ کیوں پلانا چاہتا تھا؟"

آہ! یہ دوسرے سے چاہے جانے کی تمنا مار ڈالتی ہے۔ نوری کیسے کیسے بہانوں

سے اپنی چاہت کا مطالبہ کر رہی تھی۔ وہ حاکمانہ انداز میں اس سے کام کرا رہا تھا۔ اسے ہاتھ بھی نہیں لگا رہا تھا۔ چلو ہاتھ نہ لگائے مگر باتوں سے اور نگاہوں سے چھیڑ تو سکتا تھا۔ وہ تو چھیڑنا بھی بھول گیا تھا۔

بستر پر نئی چادر بچھانے کے بعد وہ شرماتے ہوئے اس پر بیٹھ گئی خیال تھا کہ اب وہ چھیڑے گا۔ اس نے ایک ہاتھ اس کے سر پر جماتے ہوئے کہا۔ "چل اٹھ یہاں سے۔ یہ تیرے لئے نہیں اس کے لئے بچھوایا ہے۔ وہ آ کر بیٹھے گی۔"

نوری کے سر پر ایسا ہاتھ پڑا کہ تارے ناچنے لگے تھے۔ صمدو نے اسے کھینچ کر بستر سے ہٹا دیا تھا۔ وہ کراہتے ہوئے بولی۔ "تجھے کیا ہو گیا ہے۔ اس گھر میں بھلا اور کون آ کے بیٹھے گی؟"

"وہ شہر سے آئی ہے۔ ہمارے گھر آنے والی ہے۔ میرا انٹرویو لے گی۔ میری تصویر اخبار میں چھاپے گی۔"

"ارے تو ایسے بول نا جب وہ تیرے لئے اتنا کرے گی تو میں اس کی خوب خاطر کروں گی۔ مگر تو مجھے مارتا کیوں ہے؟ کیا شہر والی کو دیکھ کے دل پھر گیا ہے؟"

صمدو کے دماغ کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ شازیہ نے ایسا جادو کیا تھا کہ نوری اتنی دیر سے دکھائی نہیں دے رہی تھی اور اب نظر آئی تو ایک دم سے چڑیل لگ رہی تھی۔ کہاں شازیہ کہاں وہ؟ کہاں چاندنی کہاں کالی رات؟ وہ حیرانی سے سوچنے لگا کہ آخر کیا دیکھ کر وہ نوری کا دیوانہ بن گیا تھا؟ اس نے یہ کیوں نہ سوچا کہ اس کی پہلوانی کی شہرت دور دور تک ہے۔ کتنی ہی حسین عورتیں اسے خواب میں پہلوانی کرتے دیکھتی ہوں گی۔ کیسی حماقت ہوئی کہ سوچا نہ سمجھا دیکھا نہ بھالا اور ہڑبڑا کر اس کلوٹی پر عاشق ہو گیا۔

ماں اس وقت موتے پر گئی ہوئی تھی۔ نوری جانتی تھی کہ صمدو اس کا دیوانہ ہے۔ اسے تنہائی میں اور دیوانہ بنانے کے لئے اس نے سنگار کیا تھا۔ بالوں میں سرسوں کا تیل لگا کر کنگھی چوٹی کی تھی۔ ذرا سا تیل دونوں ہتھیلیوں پر مل کر سیاہ چہرے پر لگایا تھا تاکہ دھوپ میں چمکتی رہے۔ آنکھوں کا کاجل ایسا ہی تھا جیسے اندھیری رات کو سرمہ لگایا ہو۔ صمدو نے جھڑک کر کہا۔ "چل بھاگ یہاں سے۔"

وہ مرجھا گئی۔ فریادی نظروں سے اسے دیکھنے لگی' وہ بولا۔ "میں ابھی سے تجھے

سمجھا دیتا ہوں۔ جب وہ شہر والی آئے گی تو تو اس کمرے میں نہ آنا۔ نہیں تو وہ تجھے دیکھ کے ڈر جائے گی۔"

نوری کو یکبارگی یاد آیا کہ اس کی اپنی ماں کبھی اسے چڑیل کہتی تھی۔ آج آٹھ برس کے بعد صمدو نے بھی یہی کہا تھا کہ دوسرے اسے دیکھ کر ڈر جائیں گے۔ یعنی آٹھ برس میں وہ ذرا بھی تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ اسے ذرا سا بھی حسن نہیں ملا تھا۔ کہتے ہیں محبت ہر شے کو خوبصورت بنا دیتی ہے اور صمدو اس کے وجود سے محبت کی اس خوبصورتی کو نوچ رہا تھا۔ نقاب اٹھا کر دکھا رہا تھا کہ وہ چڑیل ہے چڑیل ہی رہے گی۔

وہ دل برداشتہ ہو کر وہاں سے چلی گئی۔ باورچی خانہ میں جا کر بیٹھ گئی۔ دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ صمدو بلائے گا تب بھی نہیں جائے گی۔ وہ چھیڑے گا تو ذرا بھی نہیں مسکرائے گی۔ اسے خوب خوب تڑپائے گی۔ ابھی تک وہ خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ ایسے پیارے لمحے اس کی زندگی میں پھر آئیں گے۔

تھوڑی دیر بعد اسے باہر کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ جواب میں صمدو نے کچھ کہا۔ نوری کان لگا کر سن رہی تھی۔ صمدو کی آواز سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ شہر والی کے آگے بچھا جا رہا ہے۔ نوری کے دل کو جیسے کوئی مٹھی میں لے کر مسلنے لگا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ صمدو کے بلانے پر بھی نہیں جائے گی۔ مگر وہ بے اختیار اٹھ گئی۔ اس کے دماغ میں شبہات شور مچا رہے تھے کہ اگر وہ اپنے حق کے لئے نہیں اٹھے گی تو وہ آنے والی اس کی دنیا لوٹ کر لے جائے گی۔

شازیہ کمرے میں آ کر بستر پر بیٹھ گئی تھی۔ صمدو ایک چھوٹی سی چوکی پر بیٹھنا چاہتا تھا۔ شازیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "یہاں بیٹھو۔ ساتھ بیٹھنے کو برا نہیں سمجھا جاتا۔"

گورے گورے خوبصورت ہاتھوں نے اسے پکڑا تھا۔ وہ تھرتھرانے لگا۔ شازیہ کے وجود میں ایسی چکناہٹ تھی کہ وہ پھسل کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت نوری وہاں پہنچ کر چیخ پڑی۔ "یہ کیا بے حیائی ہے؟"

صمدو ایک دم سے گھبرا کر کھڑا ہو گیا جیسے کوئی گناہ کیا ہو۔ نوری کی آواز کوڑے کی طرح لگی تھی۔ اس نے گھبراہٹ میں سمجھا ماں آئی ہے پھر نوری کو دیکھ کر غصہ آ گیا۔ شازیہ نے جلتی پر تیل چھڑکنے کے لئے کہا۔ "ہائے پہلوان جی! یہ چھپکلی تم پر

رعب جمارہی ہے کیا بیوی ہے یہ؟"

صمدو نے دروازے پر پہنچ کر نوری کے بالوں کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے کہا۔ "یہ سالی میری کوئی نہیں ہے۔ ماں نے بچپن سے اسے پالا ہے۔ اب یہ میرا کھا کر مجھ ہی پر غراتی ہے۔"

وہ بال پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔ "حرامزادی! میں نے سمجھایا تھا کہ ہمارے بیچ میں نہ آنا۔ تُو ہوتی کون ہے مجھے اس کے پاس بیٹھنے سے روکنے والی؟"

اس نے تڑاتڑ پٹائی شروع کردی۔ وہ روتی رہی تھی' اور بول رہی تھی۔ "مجھے نہ مار۔ میں نے تجھے اپنی عزت دی ہے۔ میں خوبصورت نہ سہی مگر عزت تو ہر ایک کی خوبصورت ہوتی ہے۔ خدا کی قسم صمدو! میرے پاس وہی ایک حسن تھا۔ اس کے بدلے مجھے پیار دے' مار نہ دے۔"

مگر اس نے مار مار کر اس کی ہڈیاں چٹخادیں۔ جب وہ بے جان سی ہو کر فرش پر گر پڑی تو وہ اپنے کمرے میں شازیہ کے پاس چلا گیا۔ اس نے تعریف کی۔ "صمدو! تم واقعی دلیر ہو۔"

وہ بولا۔ "میں نے مجبور ہو کر ایسا کیا ہے۔ نہیں تو عورت کو مارنا دلیری نہیں ہے۔"

وہ بولی۔ "یہی تو دلیری ہے۔ میں نے بڑے بڑے مرد دیکھے ہیں جو بڑے بڑے پہلوانوں کو چت کردیتے ہیں مگر ان کی عورتیں انہیں پچھاڑ کر رکھ دیتی ہیں۔"

"یہ میری عورت نہیں ہے۔ میری ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔"

"چلو اچھا ہوا کہ میں تمہاری شادی سے پہلے آگئی۔ کیا تم مجھے پسند کرو گے؟"

وہ سر جھکا کر شرماتے ہوئے بولا۔ "اللہ قسم میں ہمیشہ خواب میں تمہارے ہی جیسی خوبصورت عورت کو دیکھتا تھا۔ آج میرا خواب سچا ہو گیا ہے۔"

"خواب کو سچا کرنے کے لئے بہت سی قربانیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔"

"میں تمہارے لئے اپنی جان قربان کرسکتا ہوں۔"

"اس سے پہلے میں اپنی جان دے دوں گی۔ تمہیں پاکر تو میں نے سارے جہان

کی دولت پائی ہے مگر ایک بات ہے۔ پہلے ہم دونوں کو ہم مزاج بننا ہو گا۔"

"تم جیسا کہو گی' میں ویسا ہی بن جاؤں گا۔"

"دیکھو شادی سے پہلے چھ ماہ تم میرے ساتھ شہر میں رہو گے میں تمہیں شہر والوں کے طور طریقے سکھاؤں گی۔ شادی کے بعد میں تمہارے ساتھ اس مکان میں رہا کروں گی اور تمہاری ماں کی خدمت بھی کروں گی۔"

ماں واپس آگئی تھی اور دروازے پر کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "بیٹا! یہ کون ہے؟"

وہ دونوں چونک پڑے۔ پھر صمدو نے کہا۔ "اماں! یہ شازیہ ہے یہ تیری بہو بننے کے لئے تیار ہے۔"

شازیہ نے سر پر آنچل رکھ کر سر کو جھکا کر سلام کیا۔ ماں نے اسے دعائیں دینے کے بعد کہا۔ "بیٹی تم تو ہمارے خیال سے بھی زیادہ خوبصورت ہو۔ کہاں سے آئی ہو۔ تمہارے ماں باپ کو شادی کی بات کرنے یہاں آنا چاہئے تھا۔"

وہ بولی۔ "میرے والدین کا انتقال ہوچکا ہے۔ میں ایک چھوٹے بھائی دو چھوٹی بہنوں کے ساتھ رہتی ہوں۔ ہمارے بہت سے مکانات ہیں۔ ان سے اتنا کرایہ آتا ہے کہ ہم عیش و آرام سے زندگی گزارتے ہیں۔"

ماں نے کہا۔ "میں کسی دن تمہارے گھر آؤں گی۔"

صمدو نے کہا۔ "نہیں ماں! پہلے میں جاؤں گا۔ پھر تجھے بلاؤں گا۔"

دوسرے کمرے میں نوری کی ہڈیاں دکھ رہی تھیں۔ اپنی بے قدری اور توہین کے احساس سے دماغ سلگ رہا تھا۔ ماں بیٹے اور شہری دلہن کے باتیں کرنے کی آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ صمدو کی طوطا چشمی دیکھ چکی تھی۔ اب ماں کے رویئے کو دیکھنا چاہتی تھی اور یہ سن کر اسے تسلی ہو رہی تھی کہ ماں نے صرف ٹالنے کے لئے شازیہ کا گھر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے اسے بہو بنانے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا ہے۔

شازیہ شام تک وہاں بیٹھی ہنستی بولتی رہی۔ ماں بیٹے کو شہر کی دلچسپ باتیں سناتی رہی۔ دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھایا ان میں سے کوئی دوسرے کمرے میں جھانکنے

نہیں آیا۔ کسی نے نہیں پوچھا کہ وہ صبح سے کس حالت میں وہاں پڑی ہے۔ شام کو اندھیرا پھیلنے لگا تو شازیہ جانے لگی۔ ماں بیٹے اسے چھوڑنے مکان سے باہر آئے شازیہ نے کہا۔ "اماں! اگر میں پسند نہیں ہوں تو ابھی سے کہہ دو۔ میں تمہارا فیصلہ سن کر جانا چاہتی ہوں۔"

ماں نے کہا۔ "جوانوں کے سامنے بوڑھے کیا فیصلہ کریں گے۔ بس ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تم نے آج ہی میرے بیٹے کو دیکھا اور آج ہی شادی کے لئے اسے پسند کرلیا۔ یہ زندگی بھر نباہے جانے والا رشتہ پلک جھپکتے کیسے ہو سکتا ہے؟"

شازیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اماں تم شہر نہیں جاتی ہو فلمیں نہیں دیکھتی ہو۔ دیکھو گی تو معلوم ہو گا کہ راستے میں لڑکا لڑکی ٹکراتے ہیں اور محبت ہو جاتی ہے۔ پھر دونوں مل کر گانا گاتے ہیں اور شادی ہو جاتی ہے۔"

ماں نے حیرانی سے منہ کھول کر اس کی باتیں سنیں۔ بیٹے نے بھی تائید کی کہ ایسا ہمارے ملک میں ہوتا ہے۔ نہ ہوتا تو فلمیں ایسی نہ بنتیں۔ تازہ ترین مثال شازیہ اور صمدو کی تھی۔ انہوں نے پہلی ہی ملاقات میں شادی کا فیصلہ کرلیا تھا۔ صرف چھ ماہ کا انتظار تھا کیونکہ صمدو شہری دلہن سے ٹریننگ حاصل کرنے شہر جانے والا تھا۔

شازیہ صبح آنے کا وعدہ کرکے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ماں کو خیال آیا کہ مغرب کا وقت گزر چکا ہے اور نوری نے ابھی تک لالٹین نہیں جلائی۔ اس نے نوری کو آواز دے کر خود ہی لالٹین روشن کی۔ روشنی میں وہ فرش پر بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ ماں نے کھانے کے لئے پوچھا تو اس نے انکار کردیا۔ صمدو نے کہا۔ "نخرے کرتی ہے۔ سالی شازیہ کے سامنے میری بے عزتی کررہی تھی۔ میں پٹائی نہ کرتا تو اور کیا کرتا؟"

نوری فرش پر سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "کیا وہ گوری چمڑی والی مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے؟"

"دیکھ اماں یہ پاگل ہوگئی ہے۔ کالی چمڑی رکھ کر شازیہ سے مقابلہ کررہی ہے۔ اری شازیہ کی کالی پرچھائیں بھی تجھ سے خوبصورت ہے۔"

"کیا تُو کل تک میرا دیوانہ نہیں تھا؟"

"وہ میری بھول تھی۔"

"کیا تُونے میری عزت سے نہیں کھیلا ہے؟"

صمدو ایک دم سے بوکھلا کر ماں کو دیکھنے لگا۔ ماں یہ سن کر چونک گئی تھی۔ اس نے غصہ سے بیٹے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "جواب کیوں نہیں دیتا۔ کیا تُونے منہ کالا کیا ہے؟"

وہ سر جھکا کر بولا۔ "وہ............ مجھ سے بھول ہوگئی تھی۔"

نوری نے ہاتھ نچا کر کہا۔ "اس شہر والی کے آنے کے بعد آج سے پہلے جو کچھ کیا' سب بھول سے کیا۔ مجھ سے انکار ہے تو اماں کے دودھ سے بھی انکار کردے۔"

صمدو مارنے کے لئے آگے بڑھا۔ ماں درمیان میں آگئی۔ اس نے نوری کی حمایت میں کہا۔ "یہ ٹھیک بولتی ہے۔ تُونے اسے زخمی کیا ہے یہ جتنا بولے اتنا ہی کم ہے۔ تُونے اس غریب کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔"

ماں کی حمایت پاکر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اسے پچکارتے ہوئے کہا۔ "آنسو پونچھ لے پہلے منہ ہاتھ دھوکر روٹی کھالے۔ پھر میں انصاف کروں گی۔"

"اماں مجھے بھوک نہیں ہے۔ صرف تیرا انصاف چاہئے۔"

"پہلے میری بات مان لے۔" وہ اسے ہاتھ پکڑ کر لے گئی۔ اسے منہ ہاتھ دھونے اور روٹی کھانے پر مجبور کیا۔ جب وہ کھانے لگی تو وہ بیٹے کے پاس آئی وہ بولا۔ "میں صاف کہہ دیتا ہوں شادی ہوگی تو شازیہ سے نہیں تو میں گھر سے بھاگ جاؤں گا۔"

ماں نے آہستگی سے کہا۔ "میں بھی ایسی گوری اور خوبصورت ناک نقشے والی بہو چاہتی ہوں مگر نوری کو غصہ دکھانے سے کام نہیں چلے گا۔ تُو اس کی عزت برباد کرچکا ہے۔"

وہ بولا۔ "کالی عزت کی حیثیت ہی کیا ہے۔ میں نے تو اسے پوچھ بھی لیا۔ باہر کوئی دوکوڑی میں بھی اسے نہیں پوچھے گا۔"

"عزت کالی گوری نہیں ہوتی۔ ہر عورت کے لئے یہ جان سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ نوری نے یہی بات گاؤں والوں کے سامنے کہہ دی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ پنچایت میں لوگ تجھے اس سے شادی کرنے پر مجبور کریں گے۔

پھر شازیہ کو تُو دلہن نہیں بنا سکے گا۔"

صمدو پریشان ہو کر ماں کا منہ تکنے لگا۔ وہ بولی۔ "تو اطمینان رکھ میں نرمی سے اسے سمجھاؤں گی۔ تُو گرمی نہ دکھانا ورنہ کام بگڑ جائے گا۔"

صمدو.......... اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بستر پر لیٹنے کے بعد اس جگہ کو سہلانے لگا جہاں دن کے وقت شازیہ بیٹھی ہوئی تھی۔ نوری برآمدے میں آ کر بیٹھ گئی۔ گھر کے کاموں میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ پہاڑ جیسا محبوب چھن گیا تھا۔ گوری شازیہ نے کالی کے سینے پر ہاتھ ڈال کر کلیجہ باہر نکال لیا تھا اور اب وہ اندر سے خالی ہو کر برآمدے میں سوالی کی طرح بیٹھ گئی۔

بڑی دیر تک دونوں طرف خاموشی رہی۔ نوری سر اٹھائے آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کو تکتی رہی۔ اس کا چاند بہت دور ہو گیا تھا۔ ماں نے ہولے سے کھنکار کر کہا۔ "جب تُو یہاں آئی تو بہت چھوٹی تھی۔ میں نے ماں بن کر تجھے کلیجے سے لگایا۔ کبھی تیرے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں کمی نہیں کی۔ تجھے ہمیشہ کچھ دیتی رہی ہوں۔ تجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ آج مانگتی ہوں۔"

نوری کی نگاہیں چاند سے اتر کر زمین پر آ گئیں۔ پھر ماں کے چہرے پر سوال بن کر تھم گئیں۔ ماں نے کہا۔ "میں اپنے بیٹے کی عزت مانگتی ہوں، تُو اسے بدنام نہ کر۔"

"اماں! میں نے کب بدنام کیا ہے؟"

"نہیں کیا ہے تو کر سکتی ہے۔ میرے بیٹے سے غلطی ہو گئی۔ تیرے دامن پر دھبہ لگ گیا، تُو گاؤں والوں کو یہ دھبہ دکھائے گی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

"اماں! ایسا تو میں کبھی کر ہی نہیں سکتی۔ میں نے بچپن سے اس گھر کا نمک کھایا ہے۔ میں نمک حرام نہیں ہوں۔ پھر سب سے بری بات یہ کہ اکیلا صمدو قصوروار نہیں ہے۔ تالی تو دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے نا۔"

یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ ماں نے کہا۔ "بیٹی! تُو بہت اچھی ہے۔ بہت سمجھدار ہے۔ دنیا والے مرد کی غلطیوں کو بھول جاتے ہیں مگر عورت کی غلطی کو ڈھول بنا کر بجاتے رہتے ہیں۔"

"یہاں بدنامی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں میرا حق چھینا جا رہا ہے۔ میں انصاف چاہتی ہوں۔ شاید تم یہ سوچتی ہو کہ میرے حق میں فیصلہ نہ ہوا تو میں ماں بیٹے کو بدنام کر دوں گی۔ نہیں، یہ خیال دل سے نکال دو۔ میں کبھی بدنام نہیں کروں گی۔ ہاں اگر صمدو کے دل میں نہ رہی تو گھر میں بھی نہیں رہوں گی۔ یہاں سے کہیں دور چلی جاؤں گی۔"

"بیٹی! ایسا فیصلہ نہ کرنا۔ بے شک میں پہلے صمدو کی ماں ہوں مگر تیرے لئے بھی میرے دل میں درد ہوتا ہے۔"

"اماں! آج تو تمہیں ساس بن کر فیصلہ سنانا ہے کہ کیسی بہو پسند ہے؟"

ماں کو ذرا دیر کے لئے چپ لگ گئی۔ پھر وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ "جب تو یہاں نہیں آئی تھی تب سے ہم ماں بیٹے کتنی ہی گورے مکھڑے والی اور خوبصورت ناک نقشے والیوں کے ہاں رشتہ مانگنے گئے اور مایوس لوٹ کر آتے رہے۔ پھر صمدو تجھے اٹھا کر لے آیا ہمارے پنڈ میں بجلی نہیں آئی۔ ہم لالٹین سے گزارا کر لیتے ہیں۔ اسی طرح صمدو تجھ سے گزارا کرنا چاہتا تھا۔"

"گزارا کرنا اور بات ہے مگر وہ تو میرا دیوانہ بن گیا تھا۔"

"اس لئے کہ بازار میں چیز ایک ہو تو اسی ایک چیز کو حاصل کرنے کی دیوانگی ہوتی ہے۔ پہلے کوئی تیرے مقابل نہ تھی۔ اس لئے وہ تیرا دیوانہ تھا۔ اب خوب سے خوب تر کی بات ہے اور شازیہ خوب ترین ہے؟

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر ماں نے کہا۔ "ہاں تجھ سے گزارا ہو جاتا۔ مگر جو لوگ روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرتے ہیں وہ اچھی خوراک کا سپنا ضرور دیکھتے رہتے ہیں۔ میرا یہ برسوں کا سپنا ہے کہ بہو خوبصورت ہو اور میرے لئے خوبصورت پوتے پوتیاں پیدا کرے۔ دنیا کا ہر شخص اپنے آنگن میں خوبصورت پھول کھلانا چاہتا ہے ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ شازیہ پھول کھلانے آئے گی۔ اب وہ آ ہی رہی ہے تو ہم خوش نصیبی کو ٹھکرانے کی حماقت نہیں کریں گے۔"

ماں کا فیصلہ نوری کے منہ پر جوتے کی طرح لگا۔ اب کچھ کہنے سننے کے لئے نہیں رہ گیا تھا۔ ماں نے وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے لئے بہت خوبصورت لڑکا

تلاش کروں گی۔ بہت ہی دھوم دھام سے تمہاری شادی کروں گی۔ میں ایک حسین بہو اور خوبرو داماد لاؤں گی۔ آؤ۔ اب سو جاؤ۔ آدھی رات گزر رہی ہے۔"

ماں کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئی۔ نوری برآمدے میں اسی جگہ بیٹھی رہی اب وہ سوچ رہی تھی کہ وہاں سے اٹھ کر کہاں جانا ہے؟ جس گھر میں بیاہتا بننے سے پہلے سوکن آرہی ہو۔ وہاں وہ نہیں رہ سکتی تھی جس مرد کی آغوش میں کھیل چکی تھی۔ وہاں کسی دوسری کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

رات کے ایک بجے اس نے برآمدے سے اٹھ کر ماں کو دیکھا وہ سو چکی تھی۔ اس نے دوسرے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ صمدو بستر پر چاروں شانے چت لیٹا ہوا چھت کو تک رہا تھا۔ کبھی کبھی مسکرا رہا تھا۔ ایک لحہ کے لئے نوری کے من میں خوشی کی لہر آئی کہ وہ اسے خیالوں میں دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ دوسرے لمحے صمدو نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ پھر اسے دیکھتے ہی کروٹ بدل کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

نوری نے پوچھا۔ "صمدو! کیا میرے ساتھ گزری ہوئی کوئی بات تجھے یاد نہیں آرہی ہے؟"

وہ چپ رہا وہ بولی۔ "میں نے تیرے پیار میں زہریلا دودھ پیا تھا صمدو۔"

وہ بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ خاموش پڑا رہا۔ اس نے ٹوٹے دل سے کہا۔ "میں جارہی ہوں۔ مجھے روک لے صمدو نہیں تو میں کبھی لوٹ کے نہیں آؤں گی۔"

وہ دروازے سے الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔ "میں جارہی ہوں تیرے پیار کی' تیری بے مروتی کی قسم میں جارہی ہوں۔"

وہ دور ہوتی گئی۔ مکان کے باہر احاطہ میں آکر اس نے انتظار کیا۔ جانے کیوں اتنی سردمہری کے باوجود دل کہتا تھا کہ وہ آئے گا۔ وہ بھینسوں کے باڑے میں گئی۔ ایک ایک بھینس سے لپٹ کر بولتی رہی میں جارہی ہوں۔ کیا اتنے برسوں میں کسی کو مجھ سے محبت نہیں ہوئی؟"

بھینسیں صمدو کی طرح چپ رہیں۔ کوئی کتا ہوتا تو پیار سے کم از کم دم ہلاتا۔ تعجب ہے کہ آدمی آدمی کی طرح نہ سہی' کتے کی طرح بھی پیار نہیں کر سکتا۔ رات کے

تین بج گئے۔ ماں سو رہی تھی۔ صمدو شازیہ کے ساتھ خیالوں کی سیج پر عیش کر رہا تھا۔ کوئی اسے پوچھنے نہیں آیا۔

آخر وہ کمرے میں گئی اپنا سوٹ کیس کھول کر دو جوڑے کپڑے نکالے روپیہ اٹھنی کرکے اس نے اب تک ڈھائی سو روپے جمع کئے تھے نوٹوں کو اس نے چولی میں ٹھونسا۔ ریزگاری اور کپڑے ایک تھیلے میں رکھے۔ پھر وہ چپلیں پہن کر گھر سے نکل گئی۔

لاری اڈے کی طرف تیزی سے جاتے ہوئے اسے یوں لگا جیسے وہ اس وقت سے بھاگ رہی ہے' جب اس نے چڑیل بن کر اپنی ماں کو کھا لیا تھا اور اپنے آپ سے نفرت کرتے ہوئے دنیا سے دور چلے جانا چاہتی تھی۔ اب بھی اسے نہیں معلوم تھا کہ دنیا میں رہ کر دنیا سے دور کیسے جا سکتی ہے بس وہ بھاگنے کے انداز میں چلتی جارہی تھی۔ جب وہ لاری اڈے پہنچی تو ایک جگہ کھڑی ہو کر ہانپنے لگی۔ چاروں طرف سے مردوں کی نگاہیں اسے گھور رہی تھیں۔ گھر سے پہلی بار باہر آنے کے بعد پتہ چلا کہ اس میں کچھ ہے۔ کچھ ہوتا ہے جب ہی لوگ بار بار دیکھتے ہیں۔ وہ بہت ساری نگاہوں سے بچنے کے لئے بس کے اندر آکر بیٹھ گئی۔

پھر لوگ بس کی کھڑکی کے پاس سے گزرنے لگے۔ وہ آتے جاتے ہوئے اسے دیکھتے تھے۔ کوئی کھانستا کھنکارتا تھا۔ کوئی آہیں بھرتا جاتا تھا۔ کوئی گانے کے بہانے ٹھاہ کرکے سینے نال لگنے کا مشورہ دیتا تھا۔ نوری کو یہ بازاری حرکتیں بری لگ رہی تھیں۔ اس کے باوجود وہ سوچ رہی تھی۔ "کاش صمدو یہاں ہوتا۔ میں اسے بتاتی کہ تُو نے میری قدر نہیں کی۔ اب دیکھ دنیا والے مجھ پر کس طرح مر رہے ہیں؟"

وہ حیران تھی کہ اس میں کیا خوبی ہے' جسے صمدو نہ دیکھ سکا اور دنیا والے دیکھ رہے ہیں۔ وہ خوبصورت نہیں تھی مگر اس کی جوانی بھری ہوئی بندوق کی طرح تھی۔ ٹھائیں سے نگاہوں کو پکارتی تھی لیکن اور بھی جوان عورتیں اپنے شوہر اور عزیزوں کے ساتھ سفر کرنے آئی تھیں۔ ان عورتوں کو کوئی نہیں گھور رہا تھا۔ حالانکہ وہ نوری کے مقابلے میں حسین تھیں۔ دیکھنے والوں کا سارا زور اس کے سیاہ حسن پر تھا۔

تب یہ انکشاف ہوا کہ وہ اکیلی تھی۔ اس لئے مرد اسے مالِ غنیمت سمجھ کر

نگاہوں سے لوٹ رہے تھے۔ وہ ملبوس تھی مگر صدو کے بغیر ایک ننگا گھر تھی اور ایسے گھر پر کتنے ہی شریف بدمعاش شب خون مارنے کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اسے خود ہی اپنا محافظ بن کر رہنا تھا۔

بس چل پڑی' کنڈیکٹر نے پوچھا۔ "کہاں جانا ہے"

وہ دس کا نوٹ بڑھاتے ہوئے بولی۔ "راولپنڈی؟"

"بی بی! یہ گڈی لاہور جارہی ہے۔ چلو اتر جاؤ۔ استاد گڈی روکنا۔"

وہ جلدی سے بولی۔ "ٹھیک ہے میں لاہور جاؤں گی۔"

کتنے ہی مسافر اسے دیکھنے لگے۔ وہ جوان تھی' اکیلی تھی' کبھی راولپنڈی اور کبھی لاہور جانے کی بات کررہی تھی۔ اس طرح ظاہر ہورہا تھا کہ وہ گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہے اور اس کی کوئی خاص منزل نہیں ہے۔ کنڈیکٹر نے پیسے واپس کرتے ہوئے کہا "کوئی گل نہیں' پیسے اپنے کول رکھو' میں تینوں لاہور تک پہنچادیواں گا۔"

ڈرائیور نے اندر والے عقب نما آئینے کا رخ بدل کر اس میں نوری کو دیکھا۔

اسی وقت نوری نے ادھر دیکھا تو ڈرائیور نے آنکھ مار دی۔ وہ ایک دم سے لرز اٹھی۔ گاؤں میں آج تک کسی نے ایسی گندی حرکت نہیں کی تھی۔ صدو پہلوان سے سب ڈرتے تھے اسے پہلوان کی جاگیر سمجھ کر دور ہی سے کترا جاتے تھے۔ اس کے دل میں ایک ڈر پیدا ہوا۔ آہ' اپنا مرد بھی کیا ہوتا ہے۔ اس کے آگے سارے مرد ہیچ ہوجاتے ہیں۔

نوری نے ڈرائیور کو گھور کر دیکھا تو اس نے جلدی سے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے گاڑی کی رفتار بڑھادی۔

"کیا بہن سمجھ کر کرایہ چھوڑ رہا ہے۔ چل پکڑ یہ نوٹ اور باقی پیسے واپس کر۔"

کنڈیکٹر نے چپ چاپ کرائے کی رقم لے کر باقی روپے واپس کردیئے۔ گاڑی جب کچھ دور نکل گئی تو نوری نے بس کے اندر مسافروں کا جائزہ لیا۔ وہاں عورتیں زیادہ تھیں اور ان میں سے دس عورتیں عیسائی راہبہ تھیں۔ ایک لانبی داڑھی والا پادری ان کے ساتھ تھا۔ نوری کے ساتھ ایک گورے رنگ کی بوڑھی راہبہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے نرمی سے پوچھا۔

"بیٹی! تم اکیلی کدھر جاتی ہے؟"

وہ سرد آہ بھر کر بولی۔ "اتنی بڑی دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے اور میرا کوئی سہارا نہیں ہے۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ میں شہر جاکر محنت مزدوری کروں گی پھر اپنا ٹھکانہ بھی بناؤں گی۔"

"آسمانی باپ تم پر رحم کرے گا' جوان عورت ایک بچہ کا برابر ہوتی ہے۔ بچہ باپ کا انگلی پکڑ کے چلتا ہے۔ عورت اپنے آدمی کا انگلی پکڑ کے چلنے لگتی ہے۔ انگلی نئی ہونے سے بچہ اور عورت دونوں گر جاتی ہے۔ تم ہمارا بات سمجھنے سکتی ہے۔"

وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولی۔ "آپ بہت اچھی باتیں کرتی ہیں مگر میں کیا کروں؟ مجھے سہارا دینے والی کوئی انگلی نہیں ہے۔"

وہ نوری کے ہاتھ کو تھام کر بولی۔ "ہم کو مدر بولو۔ ہم تم کو اپنے پاس میں رکھے گی۔ ہمارے پاس بہت عورت لوگ ہے مسیح کا بندگی میں صلیب کا سائے میں تم کو کھانا ملے گا۔ کپڑا ملے گا۔ عزت ملے گا۔ نہیں تو یہ دنیا تم کو فنش کردے گا۔ ایک دم سے ختم کردے گا۔"

نوری نے اِدھر اُدھر بیٹھی ہوئی راہباؤں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "سمجھ گئی ان عورتوں کو روٹی کپڑے اور پناہ کی ضرورت نے تمہارے سائے میں پہنچا دیا ہے۔ تم انہیں عیسائی بنا کر رکھتی ہو۔ مگر میں مسلمان ہوں۔ اپنا ایمان نہیں چھوڑوں گی۔"

مدر نے کہا۔ "پاکستان غریب ملک ہے۔ جدھر غریبی مارتا ہے' ادھر ایمان کمزور ہوتا ہے۔ کتنا مسلمان لوگ عیسائی بنتا ہے۔ تم ہمارا ہاتھ پکڑو' خدا کا بیٹا (نعوذ باللہ) مسیح اعظم ہمارا تمہارا نجات دہندہ ہے۔"

وہ اپنا ہاتھ چھڑا کر بولی۔ "میرا ایمان کمزور نہیں ہے۔ مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو۔"

"اچھا نہیں کرے گا۔ مگر جب تم کو کوئی جگہ نہیں ملے گا تو کوئی بھی چرچ میں آکے مدر میریا اور فادر بنجامن کا نام پوچھو تم کو رہنے اور کھانے پینے کا جگہ مل جائے گا۔"

وہ چپ رہی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ منہ پھیر کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔

صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ وہ گھر سے باہر نئی دنیا کی نئی صبح تھی اور وہ کسی نئی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مدر نے پھر اسے عیسائیت کی طرف مائل نہیں کیا مگر نصیحتیں کرتی رہی۔ دنیا کی اونچ نیچ سمجھاتی رہی کہ لوگ بڑے سنگدل ہوتے ہیں اور دوسروں کی عزت، جان اور ایمان سب چھین لیتے ہیں۔ جب وہ لڑتے لڑتے تھک جائے تو کسی بھی چرچ کے دروازے پر آجائے عیسائیت کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔

لاہور کے لاری اڈے پہنچ کر وہ حیران و پریشان ہوگئی۔ اس نے لاہور کی بہت سی باتیں سنی تھیں اور اپنے تصور کے مطابق اسے دیکھا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ لاہور اتنا بڑا شہر ہوگا۔ اتنے بڑے آسمان کو یہاں سے وہاں تک دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر دیکھ بھی لیا تو یہ دل میں اتر جاتا ہے اور دور تک اپنی جڑیں پھیلاتا چلا جاتا ہے۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ گاؤں کی طرح کسی بھی گھر میں جاکر پناہ لے سکتی ہے۔ مگر وہاں کے اونچے اونچے مکانات سے رعب طاری ہو رہا تھا۔

مدر عورتوں کی فوج کے ساتھ کھڑی ہوئی نوری کی پریشانی کا اندازہ کر رہی تھی اور آہستہ آہستہ فادر سے باتیں کر رہی تھی فادر اچھی اردو بول لیتا تھا۔ صرف لہجے سے اس کے انگریز ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ وہ نوری کے پاس آکر بولا۔

"بیٹی! کہیں اپنا ٹھکانہ بنانے تک ہمارے پاس رہو، پھر جب چاہو چلی جانا۔ ہمارے پاس رہ کر تم مسلمان ہی رہو گی۔"

یہ کہہ کر فادر نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ نوری کو وہ شفقت بہت اچھی لگی۔ صمدو کے پاس رہ کر اس نے ماں کی بدلتی ہوئی ممتا کو دیکھ لیا تھا، بچپن سے باپ کا پیار نہیں ملا تھا۔ فادر کی شفقت پاکر اس نے سوچا۔ "آج نہیں تو کل روٹی اور رہائش کا انتظام کسی نہ کسی طرح ہو ہی جائے گا لیکن اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ کہیں بھی عزت آبرو سے رہنے کی جگہ ملے گی عزت دارالامان میں محفوظ رہ سکتی ہے یا پھر ان عیسائی عورتوں کے ساتھ بے خوف وخطر رہ سکتی ہوں۔"

یہ سوچ کر وہ فادر اور مدر کی ٹیم کے ساتھ چلی گئی۔ مال روڈ کے پاس ایک چرچ کے پیچھے سالویشن آرمی (مکتی فوج) کے کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔ جہاں وہ راہب اور راہبائیں رہتے تھے۔ وہاں کا ماحول نہایت ہی پاکیزہ تھا وہاں سب کنوارے رہتے تھے

اور کتنے ہی کنوارے پن میں بوڑھے ہو گئے تھے۔ مگر کوئی کسی کو میلی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ وہاں جنسی خواہش اور جنسی کج روی نام کو نہ تھی۔ نوری جیسی جوان عورت ایسے ماحول میں بے شک وشبہ محفوظ رہ سکتی تھی۔

وہاں سب اس سے محبت سے پیش آتے تھے۔ مسکرا کر باتیں کرتے تھے۔ لڑکیاں اسے اپنے ساتھ میز پر کھانا کھلاتی تھیں۔ سونے کے لئے ہر کمرے میں چار پلنگ تھے۔ یعنی ایک کمرے میں چار لڑکیاں رہتی تھیں۔ نوری کو بھی سونے کے لئے ایک پلنگ مل گیا تھا۔ پہلے دن وہ چرچ کے آس پاس والے علاقوں میں گئی تاکہ شہری راستوں کو یاد رکھ سکے اور اپنے لئے روٹی روزی کا ذریعہ بنا سکے۔ اس نے ہر بڑے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلنے پر اس نے جھاڑو دینے، برتن مانجھنے اور کھانا پکانے کا کام مانگا کسی کو کام والی کی ضرورت نہیں تھی کسی کو ضرورت تھی مگر اس گھر والی جوان عورت کو ملازمہ بنا کر نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اسے ملازمت نہ ملنے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ تنہا تھی اس کا کوئی پتہ ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس کی کوئی ضمانت دینے والا نہ تھا۔ فادر نے کہا۔

"بیٹی اگر ہم ضمانت دے دیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ گھر کے لوگوں میں بھی چور ہوا کرتے ہیں۔ چوری کسی نے کی اور الزام تم پر آیا تو ہم کیا کریں گے؟"

کام کرنے کے لئے اسے کوئی ضمانت دینے والا نہ ملا۔ پھر بھی وہ کام تلاش کرتی رہی۔ وہ ایک چھوٹے سے مکان کے دروازے پر گئی تو خلافِ توقع ٹھکانہ مل گیا۔ وہ گھر والی پیٹ سے تھی اور اسے ایسی جوان عورت کی ضرورت تھی جو اس کا گھر سنبھال سکے۔ اس نے بڑے پیار سے اسے گھر میں بلا کر بٹھایا۔ پھر بولی "تم جوان لڑکی ہو۔ رات ہونے والی ہے کہاں بھٹک رہی ہو۔"

"میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ میں اپنے لئے ٹھکانہ تلاش کر رہی ہوں۔"

"تم میرے پاس رہو، اگر بھوک لگی ہو تو چولہے کے پاس جاکر سالن اور روٹیاں نکال کر کھالو۔ میں ذرا مغرب کی نماز ادا کرلوں۔"

"میں رات کو دیر سے کھاتی ہوں۔ آپ نماز پڑھیں۔"

وہ جانماز بچھا کر کھڑی ہوگئی۔ نوری نے دیکھا۔ وہ گوری گوری سی معصوم سی

عورت تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں بہت دکھ اٹھاتی رہی ہے۔ نماز کے دوران دستک ہوئی تو نوری نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ایک ادھیڑ عمر کا صحت مند آدمی کھڑا ہوا تھا۔ نوری نے پوچھا۔ "کس سے ملنا ہے؟"

اس نے سر سے پاؤں تک نوری کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ گھر میرا ہے۔"

وہ جلدی سے سر پر آنچل رکھ ایک......... طرف ہٹ گئی وہ شخص سر جھکا کر آنگن میں آیا۔ پھر اپنی بیوی کو نماز پڑھتے دیکھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ نوری پھر مالکن کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ نماز ادا کرنے کے بعد وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگی۔ نوری نے محسوس کیا کہ اس دعا مانگنے والی کے ہاتھ کانپ رہے ہیں اور کبھی کبھی آہیں نکل رہی ہیں۔ نوری نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ذرا آگے بڑھ کر دیکھا۔ اس وقت تک وہ دعا کے بعد منہ پر ہاتھ پھیر رہی تھی وہ ہاتھ منہ پر ٹھہر گئے۔ چہرہ چھپ گیا۔ وہ ڈھانپ کے سامنے منہ ڈھانپ کر سسکیاں لے رہی تھی۔

نوری یہ منظر دیکھ کر تڑپ گئی۔ جلدی سے پاس آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کیا ہوا؟ آپ کیوں رو رہی ہیں؟"

وہ چپ رہی' اپنی سسکیوں اور آنسوؤں پر قابو پاتی رہی۔ نوری نے اس کی پشت پر ہاتھ رکھ کر پھر پوچھا۔ "آپ کو کیا دکھ ہے۔ مجھے بتائیں' میں آپ کے کام آؤں گی۔"

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "اللہ تعالیٰ ہی میری مشکل آسان کر سکتا ہے۔"

"ہاں اللہ تعالیٰ ہی مشکل آسان کرتا ہے مگر کچھ تو بتائیے آپ کس صدمہ سے رو رہی ہیں۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "میں ماں بننے والی ہوں۔ مگر نہیں بن سکوں گی۔"

"کیوں نہیں بن سکیں گی؟"

"میری تقدیر پھوٹ گئی ہے جب بھی ماں بننے جاتی ہوں میرا پیٹ گر جاتا ہے۔"

"کیوں؟"

"دوبارا ایسا ہو چکا ہے۔"

نوری نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔ پھر مشورہ دیا۔ سنا ہے شہر میں عورتیں ڈاکٹر

ہوتی ہیں۔ آپ عورت ڈاکٹر سے اپنا علاج کرائیں۔"

وہ اٹھ کر جانماز کو تہہ کرتے ہوئے بولی۔ "میرا علاج کوئی نہیں کر سکتا۔ بس ایک اللہ کی ذات سے امید ہے۔"

"میں دن رات آپ کا خیال رکھوں گی۔ آپ کو کوئی کام نہیں کرنے دوں گی۔ چلیں آپ آرام سے لیٹ جائیں اور مجھے حکم دیتی رہیں۔ میں چٹکی بجا کر سارے کام کر دوں گی۔"

"میرے نصیب میں آرام کہاں ہے۔ ابھی اپنے میاں کو چائے بنا کر پلانا ہے۔"

"آپ لیٹی رہیں جب مجھے یہاں رہنا ہے تو میاں صاحب کی خدمت کرنا بھی میرا ہی فرض ہوگا۔"

اس نے اسے جبراً بستر پر لٹا کر چائے تیار کی۔ پھر ایک کپ میں چائے انڈیل کر دوسرے کمرے میں لے گئی۔ میاں صاحب ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ گئے۔

"ارے تم نے تکلیف کیوں کی۔ ویسے تم ہو کون۔ کیا نام ہے؟"

"میرا نام نوری ہے۔ مالکن نے مجھے یہاں گھر کے کام کاج کے لئے رکھا ہے۔"

وہ چائے کی پیالی لیتے ہوئے بولا۔ "پھر تو تم اپنی ہوئیں۔ کیا رات کو بھی رہو گی؟"

ایسا پوچھتے وقت وہ نوری کو اوپر سے نیچے تک دیکھ رہا تھا۔ وہ' جی ہاں' کہہ کر جانے لگی۔ اس نے کہا۔ "سنو! تم بہت اچھی ہو' اور بہت خوبصورت ہو۔ تمہیں دیکھ کر پتہ چلا کہ خوبصورتی صرف گورے رنگ میں نہیں ہوتی۔"

"یہ' یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"وہی جو حقیقت ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ لیلیٰ کالی تھی مگر ایک چاہنے والے قیس کے لئے دنیا کی تمام عورتوں سے زیادہ حسین تھی تم بھی وہی حسینہ ہو۔"

نوری کمرے سے بھاگ کر آ گئی۔ یہ سن کر اس کا دل خوشی سے دھڑک رہا تھا کہ کالی ہونے کے باوجود حسین ہے۔ خوشی کے ایسے موقعہ پر صمد یاد آجاتا تھا اگر وہ ابھی ہوتا تو نوری اسے میاں صاحب کی باتیں سناتی۔ "لو سنو' شہر والے کہتے ہیں کہ حسن

کالے رنگ میں بھی ہوتا ہے۔ تم ایک گوری چھنال پر مرمٹے۔ یہ نہ سوچا کہ لیلیٰ کالی تھی اور بے حد حسین سمجھی جاتی تھی۔ قیامت تک کوئی گوری عورت لیلیٰ کے حسن کی مثال پیش نہیں کرسکے گی۔"

اس نے باورچی خانہ میں آکر اس کی صفائی کی۔ دن بھر کے پڑے ہوئے جھوٹے برتن مانجھ کر چکائے۔ چولہے پر گوشت کا سالن چڑھا ہوا تھا جب سالن تیار ہوا تو میاں صاحب تندرو سے جاکر گرما گرم روٹیاں لے آئے۔ مالکن نے عشاء کی نماز پڑھنا شروع کردی تھی۔ نوری رات کا کھانا لے کر میاں صاحب کے کمرے میں پہنچ گئی۔

میاں صاحب نے کہا۔ "میں اکیلے نہیں کھاتا۔ آؤ میرے ساتھ بیٹھ کر کھاؤ۔"

وہ سامنے کھانا رکھتے ہوئے بولی۔ "میں ابھی نہیں کھاؤں گی آپ شروع کریں۔"

وہ جانے لگی میاں صاحب نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ تعریف کرنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ہاتھ پکڑ لیا جائے وہ ہاتھ چھڑانا چاہتی تھی۔ میاں صاحب نے ایک جھٹکے سے کھینچ کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ وہ غصہ سے بولی۔

"یہ کیا حرکت ہے؟ آپ کو شرم آنا چاہیے۔"

"شرم کیسی؟ یہاں رہو گی تو عیش کرو گی۔ اچھا کھانا کپڑا ملے گا میں تمہاری تنخواہ بڑھادوں گا۔"

"میں کام کرنے کی تنخواہ لوں گی' عزت بیچنے کی نہیں.........."

میاں صاحب اسے آغوش میں بھرنا چاہتے تھے' وہ جھٹک کر کھڑی ہوگئی۔ "آپ کیسے شوہر ہیں۔ آپ کی بیوی صدمہ سے نماز میں روتی بلکتی رہتی ہے اور آپ کو عیاشی سوجھتی ہے۔ کیا آپ کو افسوس نہیں ہوتا کہ بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی ضائع ہوجاتا ہے۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولے۔ "تم چاہو تو اس بار تمہاری مالکن کا بچہ ضائع نہیں ہوگا۔"

"میں دل وجان سے چاہتی ہوں۔ میں نے نماز پڑھنے کے دوران ان کے آنسو دیکھے ہیں۔ اللہ مجھے توفیق دے۔ میں ایسی نیک بخت کے لئے جان بھی دے سکتی

ہوں۔"

میاں صاحب نے اس کے دونوں بازوؤں کو اپنی گرفت میں لے کر کہا۔ "اگر اس نیک بخت کے آنسو پونچھنا چاہتی ہو تو نیک بخت کی جگہ میرا دل خوش کرتی رہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک بچہ پیدا نہیں ہوگا۔ میں تمہاری مالکن کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا۔"

نوری نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا کہ مالکن ماں بننے سے پہلے ہی دوبار اولاد سے کیسے محروم ہوگئی۔ میاں صاحب بولے۔

"نہیں سمجھیں؟ میں سمجھاتا ہوں۔ میری دو کمزوریاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ میری آمدنی بہت ہی محدود ہے۔ میں ہیرامنڈی نہیں جاسکتا۔ دوسری کمزوری یہ ہے کہ میں شریف آدمی ہوں۔ کسی کی بہو بیٹی کو غلط نظروں سے نہیں دیکھ سکتا۔ تمہاری جیسی تنہا اور بھٹکی ہوئی عورت کی ہی خوشامد کرسکتا ہوں۔ یا پھر اپنی بیوی پر ظلم کرسکتا ہوں۔ مجھے باپ بننے کی آرزو نہیں ہے۔ مجھے کسی بچے کی نہیں عورت کی ضرورت ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے اسے کھینچ کر سینے سے لگالیا۔ وہ پھڑپھڑائی پھر چیخ پڑی۔ میاں صاحب اپنی شرافت سے ڈرتے تھے۔ اس کے چیخنے پر گھبرا کر اسے چھوڑ دیا۔ وہ پیچھے کی طرف لڑکھڑاتے ہوئے کھلے دروازے سے ٹکرائی۔ پھر وہاں سے پلٹ کر بھاگی۔ کمرے سے نکل کر آنگن میں بھاگتے وقت وہ ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ گر پڑی۔ اس نے جلدی سے سر اٹھایا تو اس کا سر جانماز کے ایک سرے پر تھا۔ مالکن اس پر دو زانو بیٹھی نماز ادا کررہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

وہ آنسو خدا سے پوچھ رہے تھے کہ وہ تیسری بار اپنے بچے کو سلامت رکھ سکے گی یا نہیں؟

وہ آنسو نوری سے پوچھ رہے تھے کیا وہ فاضل پرزے کی طرح کام آسکے گی؟

ایک شریف عورت ظلم سہتے سہتے مرتی ہے' مرجائے' دوسری شریف عورت اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی' مالکن کے آنسوؤں سے منہ پھیر کر بھاگتی ہوئی آنگن کا دروزہ کھولتی ہوئی باہر نکل گئی۔

باہر آکر وہ رک گئی۔ ابھی نو بجے تھے۔ محلے میں رونق تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی

کہ اس کے بھاگنے پر لوگ کوئی شبہ کریں۔ اس لئے وہ دروازے کے پاس رک کر ہانپنے لگی۔

جب ذرا سانس درست ہوئی تو وہ چرچ کی طرف جانے کے لئے آگے بڑھی لیکن ایک قدم بڑھاتے ہی رک گئی۔ آنگن سے مالکن کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ وہ گڑگڑا رہی تھی۔ "خدا کے لئے میرے حال پر رحم کریں۔ میں آپ کی بات نہیں مانوں گی۔"

میاں صاحب کی دھیمی گرج سنائی دی۔ "کیسے نہیں مانو گی؟ چلو..........."

تڑاخ کی آواز سنائی دی جیسے مالکن کے منہ پر طمانچہ پڑا ہو پھران کی سسکیاں اور التجائیں دور ہوتی گئیں جیسے ممتا کو گھسیٹ کر کانٹوں پر لے جایا جارہا ہو۔ نوری نے اس گھر سے منہ پھیرلیا۔ تیز قدم بڑھاتی ہوئی اس محلے سے نکل گئی۔ چرچ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ ہانپتے کانپتے مکتی فوج کے کیمپ میں پہنچ گئی۔

وارڈن نے اسے اتنی رات کو کہیں سے آتے دیکھا تو اسے فادر اور مدر کے پاس پہنچادیا۔ فادر نے کہا۔ "میرا دل کہتا ہے کہ تم بری نہیں ہو۔ اپنا ٹھکانہ بنانے کے لئے بھٹک رہی ہو۔ مگر اتنی رات کو آؤ گی تو یہاں کی راہبائیں بدنام ہوجائیں گی۔ لوگ کیچڑ اچھالیں گے کہ یہاں سے لڑکیاں راتوں کو باہر جاتی ہیں۔"

نوری نے سر جھکا کر کہا۔ "فادر! میں شرمندہ ہوں۔ پھر کبھی رات کو دیر سے نہیں آؤں گی۔"

مدر نے کہا۔ "شاباش! بہت اچھی ہے تم' تم کو یہاں رہنے کے واسطے ادھر کا طریقہ پر چلنا ہوگا۔ تمہارا لباس' تمہارا طور طریقہ ہم لوگ سے الگ ہے تم کا ادھر ہم لوگ کا ساتھ میں رہنا ہوگا۔"

فادر نے مدر سے کہا۔ "ٹھہرو' میں سمجھاتا ہوں۔" پھراس نے نوری سے کہا۔ "بیٹی! ہم تمہیں یہاں سے جانے کے لئے نہیں کہیں گے مگر جب تک ' رہو۔ راہباؤں کا لباس پہن کر رہو۔ یہ بھڑکیلے لباس نگاہوں کو بھڑکا کے اور بھڑکاتے ہیں۔"

"مگر میرے پاس تو ایسے ہی لباس ہیں؟"

"کوئی بات نہیں ہم تمہیں راہبہ کا لباس دیں گے۔ دیکھو کوئی کسی کو مسلمان یا

عیسائی نہیں بنا سکتا۔ اپنے اپنے عقیدے کی بات ہوتی ہے جس کا دل جدھر جھک جائے ادھر ہی کعبہ ہے۔"

فادر بہت اچھی بہت پیاری باتیں کرتے تھے' نوری ان کی باتوں اور ان کی شخصیت سے متاثر ہوجاتی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"بیٹی! یہ عیسائی مشنری ہے' یہاں راہبہ بن کر رہو۔ تمہارا دل چاہے تو عیسائیت قبول کرلو۔ ورنہ مسلمان ہی رہو لیکن یہاں رہ کر یہاں کے طور طریقے سیکھو۔ یہاں تمہیں نرسنگ کی تربیت دی جائے گی۔ ایک نرس بننے کے بعد تم ہمارے ساتھ رہو یا نہ رہو لیکن آئندہ اپنے بل پر زندگی گزارنے کے قابل ہوجاؤ گی۔"

نوری نے سوچا۔ "میں ان سے کتراتی ہوں اور یہ میرا ایک باعزت مستقبل بنانا چاہتے ہیں اور کوئی جبر نہیں ہے کہ میں عیسائی بن جاؤں۔ میں مسلمان ہوں۔ مسلمان ہی رہوں گی۔"

دوسری صبح اسے غسل کرنے کے لئے کہا گیا۔ جب وہ غسل سے فارغ ہوئی تو راہباؤں نے اسے لباس پہنایا وہ اسے دین ایمان کی باتیں سمجھاتی رہیں۔ پھراس کے گلے میں ایک ننھا سا صلیب پہنادیا۔ بعض اوقات آدمی ایسے موڑ پر پہنچ جاتا ہے جہاں اسے روٹی کے لئے اور عزت کے لئے دو کشتیوں پر پاؤں رکھنا پڑتا ہے۔ نوری اب مسلمان بھی تھی اور ایک عیسائی راہبہ بھی۔

☆======☆======☆

صمدو پہلوان لاہور پہنچ کر جیسے پرستان میں پہنچ گیا تھا۔ شازیہ کا مکان بہت بڑا تھا۔ وہاں اس کی دو حسین اور جوان بہنیں تھیں۔ پھر محلے پڑوس سے بہت سی لڑکیاں آتی تھیں۔ ان کے لباس رنگ برنگے ہوتے تھے طرح طرح کی ادائیں ہوتی تھیں۔ صمدو حیران حیران سا ان کی باتیں اور ان کے قہقہے سنتا رہتا۔

شازیہ اسے سمجھاتی تھی کہ ہر ایک سے بے تکلف باتیں کرنا چاہئے' خود کو اس ماحول میں رنگنا چاہئے۔ اس ماحول میں کچھ لڑکیاں سگریٹ کی عادی تھیں۔ صمدو کو وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شازیہ بھی سگریٹ کی عادی ہے پہلے تو اسے بہت برا لگا اگر نوری سگریٹ کا نام بھی لیتی تو وہ اس کی خوب پٹائی کرتا شازیہ جیسی حسین عورت کو وہ اس کی مرضی کے بغیر چھو بھی نہیں سکتا تھا۔

وہ نوری کو بڑی شدت سے یاد کرتا تھا۔ اس نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلی جائے۔ وہ ہمیشہ اسے گھر میں رکھنا چاہتا تھا تاکہ ہاتھوں میں کھجلی ہو اور شازیہ پر غصہ آئے تو وہ نوری پر غصہ اتار سکے' افسوس' وہ چلی گئی تھی۔

شازیہ نے صمدو سے کہا۔ "ہمارے ہاں مرد کے غصہ کو برا سمجھا جاتا ہے۔ کسی بھی بات کو پہلوان بن کر نہ سوچو۔ کبھی شاعر بن کر بھی دیکھو کہ یہ سگریٹ میرے سرخ ہونٹوں کے درمیان کیسا جچتا ہے۔ دیکھنے والوں کی خواہش ہوتی ہے کہ کاش سگریٹ کی جگہ وہ خوبصورت ہونٹوں کے بیچ سلگتے رہتے۔

صمدو نے کہا۔ "ہاں' یہ سچ ہے۔ ایسی خواہش میرے دل میں ہوتی ہے مگر تم کہتی ہو کہ چھ مہینے کی ٹریننگ کے بعد میری خواہش پوری ہونے دو گی۔"

"بے شک تمہاری تربیت لازمی ہے۔ ورنہ شادی کے بعد تم میری سوسائٹی میں گنواروں جیسی حرکتیں کرو گے تو میری بڑی بے عزتی ہو گی۔ جتنے سبق بھی میں تمہیں

پڑھانا چاہتی ہوں ان میں سے پہلا سبق یہ سگریٹ ہے۔ لو ایک کش لگاؤ۔"

"نہیں۔" وہ بولا۔ "زور کرنے والے سگریٹ نہیں پیتے۔"

"جاؤ بھی۔ ہم عورتوں سے زیادہ زور کوئی نہیں لگاتا یہ میری پُر زور خواہش ہے کہ اسے کش لگاؤ۔ اچھا اسے ہاتھ میں لے کر دیکھو۔"

صمدو نے سگریٹ انگلیوں میں پکڑ کر پوچھا۔ "اس میں دیکھنے کی کیا چیز ہے۔"

"اس میں میرے ہونٹوں کی سرخی اتر آئی ہے۔"

صمدو کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ گوری چٹی والی اسے گاؤں سے للچاتی چلی آ رہی تھی۔ وہ چھ ماہ تک ہاتھ نہیں آ سکتی تھی۔ بس اس کے ہونٹوں کی سرخی تھی جو ابھی مل رہی تھی۔ اس نے جھجکتے ہوئے شرماتے ہوئے اس سگریٹ کو اپنے ہونٹوں میں دبالیا۔ پھر ایک ہلکا سا کش لگایا۔ شازیہ نے بتایا کہ کش کیسے لگایا جاتا ہے۔ وہ کبھی اپنے ہونٹوں میں سگریٹ لیتی تھی۔ کبھی اس کے ہونٹوں میں دیتی تھی۔ ایسے خوبصورت انداز میں سبق پڑھایا جائے تو بھلا پڑھنے اور یاد رکھنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ پہلے ہی دن سے سگریٹ اس کے دل کو لگ گئی۔

انسان پر سب سے زیادہ اثر ماحول کا ہوتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ آدمی آگ کے پاس ہو اور اسے آنچ نہ لگے۔ شازیہ کے حویلی نما مکان میں دوپہر سے شام تک حسین لڑکیاں آتی جاتی رہتی تھیں۔ وہ سب اسی محلے میں رہتی تھیں۔ شازیہ ایسی پسندیدہ شخصیت تھی کہ سب اس کے پاس زیادہ وقت گزارتی تھیں۔ اب اس کے پاس آنے کا مطلب یہ ہوا کہ صمدو کے پاس آتی تھیں اور اسے خوب چھیڑتی تھیں۔ وہ شازیہ سے ہونے والے رشتے کے مطابق سب کا دولہا بھائی تھا اور سب اعزازی سالیاں تھیں۔ ایسی سالیاں جو اس کے کبھی چٹکی لیتی تھیں اور کبھی اس کے ہونٹوں سے سگریٹ جھپٹ کر اپنے ہونٹوں میں دبالیتی تھیں اور کسی بات پر قہقہے لگاتے ہوئے بے اختیار اس سے لپٹ جاتی تھیں۔ پھر اسے آنچ کیوں نہ لگے؟

وہ شازیہ کا عاشق تھا لیکن کبھی ریشماں بھی اچھی لگتی تھی۔ نورس کوئی بات کرتے وقت ایک خاص ادا سے اس کے جسم سے لگ جاتی تو پھر اسے نورس کے سوا کوئی نظر نہ آتا۔ ان میں سب سے حسین بینا تھی۔ وہ بینا کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔

جب وہ کچھ بولتی تو جیسے منہ سے سحر پھونک دیتی تھی۔ اسی بینا نے اسے پہلی بار چرس کا سگریٹ پلایا تھا۔

اگر صمدو کی ماں یا اس کے پنڈ والا کوئی بندہ اسے دیکھ لیتا تو کبھی یقین نہ کرتا کہ صمدو ایک ماہ میں اتنا بدل گیا ہے۔ پہلے وہ طوائفوں کو گالیاں دیا کرتا تھا لیکن شازیہ نے جب سے اپنی من گھڑت دکھ بھری داستان سنائی تھی تب سے وہ قائل ہوگیا تھا کہ ہر طوائف قابلِ نفرت نہیں ہوتی' پھر ریشماں۔ نورس' بینا' ٹینا' مہ ناز اور شہناز وغیرہ نے اسے محبت کرنا سکھا دیا تھا۔ پہلے وہ سگریٹ نوشی سے پرہیز کرتا تھا' اب سگریٹ کا پیکٹ اس کی جیب میں رہتا تھا اور دن میں کوئی نہ کوئی اسے چرس بھرا سگریٹ پلا ہی دیا کرتا تھا۔

وہ دو ماہ بعد ماں سے ملنے گاؤں گیا تھا۔ مگر شام ہوتے ہی شازیہ اور دوسری حور پریاں ایسی یاد آئیں کہ رات گزارنا مشکل ہوگیا۔ وہ رات کا کھانا کھاتے ہی وہاں سے واپس آنے لگا۔ ماں نے روکا تو اس نے کہا۔ "صبح وہاں کے اکھاڑے میں پہنچنا ضروری ہے۔ شہر کے بڑے بڑے پہلوان زور کراتے ہیں۔ میں نئے نئے داؤ پیچ سیکھ رہا ہوں۔"

وہ باتیں بنا کر چلا آیا۔ مگر اپنا جھوٹ اپنے ہی دل پر پتھر کی طرح لگا۔ اسے خیال آیا کہ شیدا پہلوان سے دنگل لڑنے کے لئے صرف پانچ ماہ رہ گئے تھے۔ اگر اب بھی اس نے صبح وشام دوسرے پہلوانوں سے زور آزمائی نہ کی تو نورا کشتی لڑنے والے شیدا سے منہ کی کھائے گا۔ شہر میں کئی پہلوانوں سے اس کی دوستی تھی۔ اس نے دوسرے دن طوطا پہلوان سے یہ طے کیا کہ وہ صبح وشام اس کے اکھاڑے میں آکر زور کیا کرے گا۔ پھر اس نے شازیہ کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ وہ خوش ہو کر بولی۔ "یہ تم نے اچھا کیا۔ تمہیں ابھی دنگل کی تیاری کرنا چاہئے۔ جب تم شیدا پہلوان کو پچھاڑ کے پچاس ہزار روپے جیت کر آؤ گے تو میں شہر کے بڑے بڑے لوگوں کو دعوت دوں گی۔ بہترین باورچی سے کھانا پکواؤں گی۔ کھانا کھلانے کے بعد بینا' ٹینا' مہ ناز' شہناز ایسا مجرا پیش کریں گی کہ سارے شہر میں تمہارا چرچا ہوتا رہے گا۔ لو یہ سگریٹ پی لو.........."

صمدو نے چرس کا وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "کل سے اکھاڑے میں جاؤں گا تو سگریٹ چھوڑ دوں گا۔"

یہ ایسی ہی بات تھی جیسے موت کہے کہ وہ زندگی کا پیچھا چھوڑ دے گی۔ اگر مستقل مزاجی ہو تو سگریٹ چھوٹ جاتی ہے لیکن چرس کا نشہ موت کی طرح پیچھا کرتا ہے۔ نشہ دماغ کو کمزور کرتا ہے۔ دماغ کمزور ہو تو مستقل مزاجی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جس روز اکھاڑے میں اترا' اس روز اس نے سگریٹ کو منہ نہیں لگایا۔ مگر چرس کی طلب ہونے لگی۔ اس رات اس کا سر بھاری ہوگیا۔ بدن اینٹھنے لگا۔ آنگن میں چارپائی بچھا کر کھلی ہوا میں لیٹنے کے باوجود اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ آدھی رات کو شازیہ نے کہا۔ "یوں جاگتے رہے تو صبح اکھاڑے میں نہیں جاسکو گے۔ اپنی ضد چھوڑ دو اور دو چار کش لگالو۔"

وہ دس بجے سوجانے کا عادی تھا اور اب آدھی رات گزر چکی تھی۔ تمام رات جاگنے کے بعد وہ صبح اکھاڑے میں اونگھنا نہیں چاہتا تھا۔ شازیہ نے اسے سگریٹ سلگا کر دیا۔ اس نے اپنے دل میں عہد کیا کہ دو چار کش سے زیادہ نہیں لگائے گا۔ احمقانہ عہد تھا۔ پہلا کش لگاتے ہی بچھڑے ہوئے نشہ میں جیسے کھوئی ہوئی جنت مل گئی۔ شازیہ اپنی دو بہنوں کے مقابلے میں عمر رسیدہ لگتی تھی۔ چرس کی سگریٹ کے دو چار کش کے بعد وہ نوخیز دوشیزہ نظر آئی۔ سر کی گرانی اور ہاتھ پاؤں کی اینٹھن ختم ہو رہی تھی۔ بہ یک وقت کتنے فائدے پہنچ رہے تھے۔ وہ مست ہو کر پیتا رہا اور شازیہ کو چھیڑتا رہا۔ پتہ نہیں کتنی دیر وہ مستی میں رہا مگر جب وہ بستر پر گرا تو بے اختیار اس کی زبان پر نوری کا نام آگیا۔

شازیہ جھانسے دینا خوب جانتی تھی۔ وہ تڑپتا تھا۔ نوری نے جو مسرتیں اسے دی تھیں۔ شازیہ ان مسرتوں سے........... محروم کرکے اسے جھوٹی تسلیاں دے کر چلی جاتی تھی۔ تب دل سے نوری کا نام ایک آہ بن کر نکلتا تھا۔ تب اسے احساس ہوتا تھا کہ وہ اندر سے خالی ہے یا نوری کے بغیر ادھورا ہے۔ اسے دنیا کی کوئی عورت مکمل نہیں کرسکتی۔

وہ رات کو دیر سے سویا تھا۔ صبح دیر تک سوتا رہا۔ اکھاڑے میں نہ جاسکا۔ یہ

ایک دن کی بات نہیں تھی۔ اکھاڑے سے اکثر وہ غیر حاضر رہنے لگا۔ وہ جوان تھا۔ پہاڑ جیسے جسم میں بلا کی طاقت تھی اس لئے ابتدا میں چرس کے زہریلے اثرات کو نہ سمجھ سکا نشے کی دیمک اسے اندر سے چاٹ رہی تھی پھر ایک ماہ بعد شازیہ اچانک ہی اس پر مہربان ہوگئی۔ اپنے آپ کو جسم وجان سے اس کے حوالے کردیا۔ اسے پھر سے بھولی ہوئی مسرتوں کا چسکا لگا دیا۔

پہلے پہل شازیہ اسے اچھی لگی۔ پھر رفتہ رفتہ عقل آئی کہ اس کا حسن اور جوانی ایک فریب ہے۔ نوری کے مقابلے میں وہ بہت بدصورت ہے۔ وہ ایک خوبصورت سرورق والی کتاب تھی۔ اس کا سرورق الٹ کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک پرانی بوسیدہ سی کتاب ہے جسے صمد جیسے احمق کے سوا کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ ایک دن اس نے نشے کی حالت میں شازیہ سے کہہ دیا۔ "تم تو بہت عمر والی ہو۔ میں سمجھتا تھا تم میرے لئے جوان ہوئی ہو۔ مگر تمہاری تو جوانی گزر چکی ہے۔"

شازیہ نے پوچھا۔ "تمہیں مجھ سے محبت ہے یا میری عمر سے؟"

اگر وہ کہتا کہ عورت کی نوعمری سے محبت ہوتی ہے تو وہ بے لوث محبت کرنے والا نہ کہلاتا۔ اگر کہتا کہ تمہاری عمر سے نہیں تم سے محبت ہے تو پھر اس کی شکایت آپ ہی آپ ختم ہو جاتی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "نہیں میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔ مجھے تم سے محبت ہے مگر تعجب ہوتا ہے کہ تم اوپر سے اتنی جوان، اتنی کم عمر کیسے نظر آتی ہو؟"

وہ بولی۔ "تم نے نقشہ میں دیکھا ہے ناکہ دنیا گول ہے؟ مگر گول نہیں ہے ذرا چپٹی ہے۔ ساری کی ساری دنیا اندر سے پچکی ہوئی ہے۔ تم جب تک کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے، اسے دور سے دیکھتے رہو گے تو وہ بے حد خوبصورت نظر آتی رہے گی اور جب اسے حاصل کرلو گے تو رفتہ رفتہ تمہیں اس کے عیب نظر آنے لگیں گے۔"

صمد اس کی باتوں سے قائل نہ ہوسکا۔ کیونکہ اسے نوری یاد آرہی تھی جس میں کوئی عیب نہ تھا۔ اس کا ظاہر اور باطن ایک تھا صرف رنگ کالا تھا اور اب وہی کالا رنگ دل کو چھو رہا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس گوری چٹی کے سامنے وہی کلوٹی یاد آتی رہتی تھی۔

☆------☆------☆

نوری بستر پر لیٹی ہوئی اندھیرے میں صمد کو دیکھ رہی تھی۔ یہ محبت بڑے کمال کی چیز ہے۔ بچھڑنے والا روشنی میں نظر نہیں آتا محبت تاریکی میں اس کا جلوہ دکھاتی رہتی ہے۔ وہ صمد کا چہرہ صاف دیکھ رہی تھی۔ سرد آہیں بھر رہی تھی۔ "آہ! کیا وہ مجھے کبھی یاد کرتا ہوگا؟ کبھی تو کوئی ایسی بات ہوتی ہوگی جس کے بہانے میری یاد آتی ہوگی۔"

کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ دوسری راہبہ جو اس کے ساتھ اس کمرے میں رہتی تھی اس وقت تاریکی میں نظر نہیں آرہی تھی لیکن کمرے میں اس کے وجود کا احساس ہوتا تھا۔ رات کے ایک بجے راہبہ نے ہولے سے آواز دی۔ "نوری! کیا تم سو رہی ہو............ نوری؟"

راہبہ جب دھیمی سرگوشی میں رازدارانہ انداز میں اسے پکارتی تو وہ تاریکی میں خاموش پڑی رہتی۔ اسے وہ راتیں یاد آجاتی تھیں، جب وہ اماں کے پاس سوتی تھی اور صمد کھڑکی کے باہر سے سرگوشیانہ صداؤں کا سحر پھونکتا تھا۔ یہ سوچ کر انگڑائیاں آنے لگتی تھیں کہ اسے چاہنے والا اسے حاصل کرنے، اسے گود میں اٹھا کر جانے کے لئے کیسے جتن کر رہا ہے۔

وہ لیٹے ہی لیٹے ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لینا چاہتی تھی، مگر ہاتھ اٹھاتے ہی تھم گئی۔ پاس والے بستر پر سرسراہٹ سنائی دی۔ راہبہ وہاں سے اٹھ رہی تھی۔ گہری خاموشی میں اس کے لباس کی سرسراہٹ چغلی کھا رہی تھی۔ نوری تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی مگر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ذرا دیر بعد ہی بڑی آہستگی سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ باہر کاریڈور میں بھی گہری تاریکی تھی۔ وہ دروازہ پھر کب بند ہوا پتہ نہ چلا۔ وہ باہر چلی گئی تھی۔

اس نے ہاتھ اٹھا کر بھرپور انگڑائی لی۔ وہاں رہبانیت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جذبات کو سرد رکھا جاتا تھا۔ ہوس کو کچل کر ختم کردیا جاتا تھا۔ دنیا کے یکے بعد دیگرے جتنے مذاہب آئے سب ہی میں کسی نہ کسی طور نفس کو خلافِ فطرت مار ڈالنے کا درس ملتا ہے۔ ہر مذہب میں راہب، راہبہ، داسی، اور برہمچاری ملتے ہیں صرف اسلام ایک ایسا دین ہے جس نے خلافِ فطرت کسی بھی جذبے کو کچلنے کی اجازت نہیں دی۔

جذبوں کی تسکین کے جائز اور مہذب راستے ہموار کئے۔ سیلاب کے آگے بند باندھا جائے تو وہ بند کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ توڑ نہ سکے تو وہ سیلاب راستہ بدل کر دوسرے راستے سے گزرتا ہے۔ راہبہ راستہ بدل کر گئی تھی صبح ہونے سے پہلے واپس آگئی۔ اندھیری رات میں رہبانیت کا بھرم رہ گیا۔

خرگوش کی ایک عادت ہوتی ہے۔ جب وہ کسی سے ڈر کر بھاگتا ہے تو کسی جھاڑی یا شگاف میں اپنا منہ چھپا لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ شکاری سے اور ساری دنیا کی نظروں سے چھپ گیا ہے۔ انسان بھی کچھ ایسا ہی ہے جب تک گناہ اور جرائم اس کی نگاہوں سے چھپے رہتے ہیں اس وقت تک وہ خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ اس نے اپنے معاشرے یا اپنے ماحول سے برائی کو ختم کردیا ہے۔ کسی بھی ناصح اور مصلح کے پاس تاریک رات کے تاریک لمحات کا حساب نہیں رہتا۔

بہرحال کوئی سی جگہ ہو' وہ تھوڑی اچھی ہوتی ہے' تھوڑی خراب ہوتی ہے۔ نوری جہاں تھی' وہ ماحول نسبتاً بہتر تھا۔ وہاں اسے ہر طرح کا تحفظ حاصل تھا۔ وہاں اس نے ابتدائی طبی امداد پہنچانا سیکھ لیا تھا اور اب نرسنگ کا کورس مکمل کر رہی تھی۔ اس کے لئے وہ دوسری راہباؤں کے ساتھ ہسپتال جاتی تھی۔ پریکٹیکل کے دوران مریضوں کی خدمت کرتی تھی۔ اس کے دن اچھے گزر رہے تھے لیکن کچھ عرصے بعد اس نے دیکھا کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ گوری اور خوبصورت راہبائیں مریضوں کا ٹمپریچر دیکھتی تھیں انہیں دوائیں پلاتی تھیں اور انجیکشن لگاتی تھیں لیکن جب کوئی مریض قے کرتا یا اس کے زخموں سے خون اور پیپ کو صاف کرنا ہوتا تو وہ نفاست پسند حسینائیں پیچھے ہٹ جاتیں اور نوری کو اس کام کے لئے آگے بڑھا دیتی تھیں۔ زچگی کے بعد جو بچہ غلاظت میں لتھڑا ہوتا تھا اس کی صفائی کے لئے اسے نوری کے حوالے کیا جاتا تھا۔ وہ رفتہ رفتہ مشتعل ہوتی گئی۔ "کیا میں کالی ہوں اس لئے مجھے بھینسوں کے باڑے سے لے کر انسانوں کے باڑے تک صرف غلاظت اٹھانے کے قابل سمجھا گیا ہے کیا میں نفاست پسند نہیں ہوں؟"

ایک بار تو مشتعل ہو کر فادر کے پاس پہنچ گئی۔ فادر نے اس کی شکایت سن کر کہا۔ "بیٹی! ہمارا کام انسانوں کے درمیان غلاظتیں دور کرنا ہے۔ جو راہبہ ایسے فرائض سے

کترا کر نکل جاتی ہے اس کا محاسبہ ہونا چاہئے۔ تم فادر بنجامن کے پاس جا کر ایسی راہباؤں کے نام پیش کرو۔ ہم ان سے جواب دہی کریں گے۔"

رات کے کھانے کے بعد وہ راہب بنجامن کے پاس گئی۔ وہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھا' موٹی سی عینک لگائے طب کی ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ چہرہ کسی فریادی جیسا تھا جیسے وہ اندر سے اپنے آپ کو مار رہا ہو اور اوپر سے خود کردہ ظلم کے خلاف فریاد کر رہا ہو۔ وہ نوری کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "آؤ نوری آؤ............"

وہاں کسی کے بھی نام کے ساتھ سسٹر یا برادر کا رشتہ لگایا جاتا تھا۔ اسے سسٹر نوری کہنا چاہئے تھا لیکن وہ صرف نام لے رہا تھا' بہن نہیں کہہ رہا تھا۔ نوری نے اپنی شکایت پیش کی۔ اس نے سنا مگر سننے کے دوران اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتا رہا۔ پھر وہ موٹی سی کتاب چھوٹی سی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہارے ساتھ جانے والی راہباؤں کو کال کروں گا۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔"

وہ آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے نوری کے بالکل سامنے پہنچ گیا۔ اب وہ بولتے وقت کانپ رہا تھا۔ "تم سفید لباس میں بہت خوبصورت لگتی ہو۔ تم' تم برا تو نہیں مان رہی ہو؟ وہ۔ وہ بات یہ ہے کہ۔ کہ خوبصورت لگ رہی ہو اس لئے خوبصورت کہہ رہا ہوں۔"

نوری اس کا منہ تکنے لگی۔ صدو سے بچھڑنے کے بعد وہ تعریف کے دو بول سننے کے لئے ترس گئی تھی۔ راہب بنجامن گورا اور سرخی مائل تھا۔ صورت بھی اچھی تھی۔ نوری نے پوچھا۔ "مجھ میں ایسی خوبصورتی کیا ہے؟ میں تو کالی ہوں۔"

"حسن کو رنگ سے نہیں پرکھا جاتا۔ تمہارا ناک نقشہ تو اچھا ہے تمہارا جسم اتنا متناسب اور بھرپور ہے کہ۔ کہ میں بتا نہیں سکتا کہ تمہیں دیکھ کر کیا ہونے لگتا ہے۔ تم۔ تم برا تو نہیں مان رہی ہو؟ کسی سے بولو گی تو نہیں؟"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "کسی سے نہیں بولوں گی۔ مگر میرا ایک کام کرو گے؟"

"ایک نہیں ہزار کام کروں گا۔ بلکہ میں نے سوچا ہے کہ جب تم عیسائی نہیں ہو'

راہبہ نہیں ہو تو تمہیں نرسنگ کورس کے دوسرے سینٹر میں جانا چاہئے۔ وہاں بورڈنگ میں تمہاری رہائش کا انتظام ہو جائے گا۔ میں سفارش کروں تو تمہیں وہاں داخلہ ضرور مل جائے گا۔"

نوری نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "تم کتنے اچھے' کتنے مہربان ہو مگر میرا ایک کام کرو گے؟"

وہ نوری کا لمس پاکر تھرتھر کانپ رہا تھا۔ بولا۔ "بتاؤ کیا کروں؟"

"میرے ساتھ ایک بار میرے پنڈ چلو۔ صمدو کے سامنے ایک بار بول دو کہ میں خوبصورت ہوں۔ میرے جیسی اسے کوئی نہیں ملے گی۔"

"یہ صمدو کون ہے؟"

"پہلوان ہے۔ میری اس سے شادی ہونے والی ہے۔"

راہب نے تھوک نگل کر کہا۔ "پہلوان ہے۔ مم۔ مگر میں یہ جگہ چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ ہم اپنے ٹائم ٹیبل کے پابند ہوتے ہیں۔ صمدو کو یہاں بلاؤ میں اس کے سامنے تمہاری خوب تعریفیں کروں گا۔"

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ "وہ نہیں آئے گا۔ ایک خوبصورت بلا اس کے پیچھے پڑ گئی ہے۔"

"تو پھر اس ہرجائی کو بھول جاؤ۔ میں میں تمہارا ہوں۔ جب تم ہوسٹل میں چلی جاؤ گی تو میں تم سے آکر ملتا رہوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ اچانک ہی لپٹ گیا۔ نوری ایک جھٹکے سے الگ ہو کر بولی۔ "برادر! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"تم۔ تم برا تو نہیں مان رہی ہو؟ میں تمہارے لئے............"

وہ بات کاٹ کر بولی۔ "ہاں' اب برا مان رہی ہوں۔ کیا تم نے یہی میری خوبصورتی سمجھی ہے؟ نہیں تم نہیں سمجھے۔ میں سمجھاتی ہوں سنو! میرا حسن یہ ہے کہ میں صرف اپنے مرد کی دیوانی ہوں۔ میری خوبصورتی کا راز یہ ہے کہ میں دوسروں کے لئے لاحاصل ہوں۔ آئندہ مجھے کبھی ہاتھ بھی نہ لگانا میں بہت مہنگی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ جانے لگی۔ برادر بنجامن نے کہا۔ "ٹھہرو کیا تم نہیں چاہتیں کہ یہاں

سے نکل کر دوسرے سینٹر میں جاؤ اور اپنا بہتر مستقبل بناؤ؟"

وہ پلٹ کر بولی۔ "میں زندگی میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ حالات نے مجھے سمجھا دیا ہے کہ اس دنیا میں سب غرض کے بندے ہوتے ہیں۔ کچھ لئے بغیر کچھ دیتے نہیں' تم بھی وہی ہو۔"

"تم سمجھ دار ہو۔"

"تمہاری توقع سے زیادہ سمجھدار ہوں۔ تم سے اپنا کام نکالنا جانتی ہوں۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ مجھے دوسرے سینٹر میں بھیج دو۔ یہاں رہوں گی تو سسٹر روزی کو کبھی تمہارے پاس نہیں آنے دوں گی۔"

وہ ایک دم سے گھبرا کر اسے دیکھنے لگا۔ نوری نے کہا۔ "سسٹر روزی سمجھتی ہے کہ میں گہری نیند میں سوتی ہوں' کچھ نہیں جانتی ہوں لیکن میں ایک بار یہاں تک اس کا پیچھا کر چکی ہوں۔"

اس کے گھٹنے کانپ رہے تھے۔ وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم۔ تم جانتی ہو؟"

"ہاں۔ میں تم لوگوں کی مجبوریاں سمجھتی ہوں اس لئے ہمدردی سے چپ رہی۔ تم چاہو گے تو آئندہ بھی چپ رہوں گی۔ کیا میری شرافت کی قدر کرو گے؟"

وہ شکست خوردہ انداز میں اوپر سے نیچے سر ہلانے لگا۔

ایک ہفتے کے اندر ہی وہ دوسرے سینٹر میں بھیج دی گئی۔ وہاں کے ہوسٹل میں اس کے رہنے اور کھانے پینے کا انتظام تھا۔ ٹریننگ کے دوران اسے سو روپے ماہوار ملنے لگے۔ اس نے راہبہ کا لباس اتار دیا تھا۔ پھر وہی شلوار کرتا پہننے لگی تھی۔ وہ بہت خوش تھی' بہت مطمئن تھی۔ اپنے پاؤں سے کسی اونچے مقام تک پہنچ کر ایک بار صمدو کے سامنے جانا چاہتی تھی۔ دیکھنا چاہتی تھی کہ اب بھی اسے اس کے اندر کوئی خوبصورتی نظر آتی ہے یا نہیں۔

اپنی جدوجہد کے دوران ایک صبح اس نے اخبار میں پڑھا درمیانی صفحے پر ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی تھی کہ شیدا پہلوان نے ایک منٹ کے اندر صمدو پہلوان جیسے شہ زور کو پچھاڑ دیا۔

☆======☆======☆

صمد جیسے زمین پر گڑا جا رہا تھا۔ ایسی شرمناک شکست کھانے کے بعد کسی کو منہ نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں چھپ کر شازیہ کے دروازے پر آیا تو دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ پڑوسیوں سے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ وہ کسی رشتے دار کے ہاں گئی ہے۔ صبح آئے گی۔

صمد کو اپنی بے عزتی کا شدت سے احساس ہوا۔ کہاں تو وہ بڑے بڑے لوگوں کی دعوت کرنے والی تھی۔ کہاں یہ کہ دروازے پر تالا ڈال کر اسے بے گھر کر کے چلی گئی تھی۔ پہلی بار رنڈی ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

وہ غصے سے تلملاتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔ پہلے ارادہ کیا کہ پنڈ واپس جائے گا اور کبھی شازیہ پر تھوکنے نہیں آئے گا۔ پھر خیال آیا کہ اس کا تھوڑا بہت سامان شازیہ کے گھر میں پڑا ہے۔ وہ سامان وہاں سے لانا ہی ہوگا۔ وہ مجبور ہو کر رات گزارنے کے لئے طوطا پہلوان کے پاس آ گیا۔ طوطا پہلوان.......... نے غصے اور پریشانیوں کی وجوہات معلوم کرنے کے بعد کہا۔ "پہلوان! عورت اور نشہ یہ دو چیزیں تو آدمی کو آدمی نہیں رہنے دیتیں پھر پہلوان کہاں رہنے دیں گی؟ شیدا ایسا شہ زور نہیں ہے تمہاری بری عادتوں نے تمہیں کمزور بنایا ہے۔"

اس رات طوطا پہلوان کے اصرار کے باوجود اس نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ بھوک مر گئی تھی۔ نیند اڑ گئی تھی۔ بس ایک غصہ تھا شکست کھانے کا.......... اور غصہ تھا عورت کی بے وفائی کا اور غصہ تھا گھر سے بے گھر ہونے کا.......... اور سب سے زیادہ غصہ تھا کہ نوری چھوڑ کر کیوں چلی گئی۔ وہ رہتی تو کم از کم اس کی پٹائی کر کے کچھ قرار آ جاتا۔

وہ چارپائی پر پڑا چاروں شانے چت لیٹا ہوا صبح تک آسمان کو تکتا رہا اور ذہن سے نوری کو جھٹکنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ غصے اور دکھ کے وقت وہ کلوٹی کیوں یاد آنے لگی ہے؟ جب کوئی اپنا نہیں ہوتا تھا تو ایک وہی اپنی لگتی تھی۔ ایسا پیار کون دے گی کہ مار بھی کھائے گی اور آغوش میں گھستی بھی چلی آئے گی۔ صمد کے سینے سے ایک آہ نکلی۔ صبح ہوتے ہوتے وہ نوری کی پٹائی کرنے کے لئے نہیں،

اس کے سینے سے لگنے کے لئے اسے یاد کرتا رہا تھا۔

دوسرے دن دس بجے وہ شازیہ کے دروازے پر پہنچا وہاں شیدا پہلوان اپنے چمچوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ صمد کو دیکھتے ہی بولا۔ "آؤ پہلوان! رات بھر کہاں رہے؟ میں نے جیت کی خوشی میں شازیہ اور ان کی بہنوں کو مجرے کے لئے بلایا تھا۔ تمہیں تو بڑی پریشانی ہوئی ہوگی۔"

صمد ہونٹوں کو بھینچ کر اندر ہی اندر دانت پیسنے لگا۔ پھر اس نے شازیہ سے پوچھا۔ "شیدا سے تمہاری پہلے کی یاری ہے؟"

شازیہ نے "اونہہ" کر کے منہ پھیر لیا۔ شیدا نے کہا۔ "ہاں، بہت پہلے کی یاری ہے مگر مجھ سے نہیں میرے ان یاروں سے ہے۔ میں عورت اور نشہ کو منہ نہیں لگاتا۔ اگر تم نورا کشتی کے لئے راضی ہو جاتے تو میں تمہیں بھی ان حرام چیزوں کو منہ لگانے نہ دیتا۔ آخر ہم پہلوان برادری سے تعلق رکھتے ہیں، ایک دوسرے کو حرام کاریوں سے بچانا ہمارا فرض ہے۔"

اس نے شازیہ کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "اچھا۔ تو میرے ساتھ سازش ہوئی ہے؟"

شیدا نے جواب دیا۔ "اس عورت سے کچھ نہ پوچھو۔ اسے میں نے تین ہزار روپے میں تمہارے لئے خریدا تھا۔ آٹھ ماہ کے دوران یہاں تمہارے کھانے پینے میں بارہ ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں یعنی میں نے صرف پندرہ ہزار میں پچاس ہزار روپے کی کشتی جیت لی۔ اپنا ٹائٹل بھی برقرار رکھا۔ یہ زمانہ ایسا ہے کہ اپنی شہرت برقرار رکھنے کے لئے کنجریوں کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔"

اس دوران شازیہ نے اس کا ایک سوٹ کیس لا کر اس کے پاس پٹخ دیا تھا۔ صمد کے بس میں ہوتا تو وہ شیدے اور شازیہ کی خوب پٹائی کرتا مگر وہاں غنڈوں کی فوج بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "شیدے! ہم پہلوان نہیں ہیں پہلوانوں کے نام پر دھبہ ہیں۔ جو مرد ہوتے ہیں، شہ زور ہوتے ہیں وہ کنجری کا سہارا نہیں لیتے ہیں اور نہ ہی کنجری کے جال میں پھنستے ہیں۔ ہم تو شاید مرد بھی نہیں ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا آیا۔ اس نے عہد کر لیا کہ اب پہلوانی نہیں کرے گا

اور آئندہ کبھی شہر کا رخ نہیں کرے گا۔ اپنا پنڈ اپنی جنت ہے۔ وہاں جھوٹی شان اور شہرت کے لئے کوئی کسی کو فریب نہیں دیتا۔ وہاں کوئی کنجری نہیں رہتی اور معصوم پنڈ والوں تک ابھی چرس کا نشہ نہیں پہنچا ہے۔

جب وہ ماں کے قدموں میں واپس آیا تو اس کے پاس ایک ہفتے کے لئے چرس کا اسٹاک تھا۔ شاذ یہ چھوٹ گئی تھی۔ کسی دن کھانا بھی چھوٹ سکتا تھا۔ اس نشہ کے بغیر دنیا پھیکی پھیکی سی' اجڑی اجڑی سی لگتی تھی۔ جسم دکھتے دکھتے اندر سے جیسے پھٹنے لگتا تھا۔ اور جب وہ چرس کی سگریٹ کے کش لگانے شروع کرتا تو دنیا بدل جاتی تھی۔ ہر چیز حسین نظر آتی تھی۔ مگر اب نشہ کی مستی میں نوری شدت سے یاد آتی تھی۔

ایک ہفتہ بعد چرس کی طلب ہوئی۔ یہ لعنت شہر ہی میں مل سکتی تھی اور وہ شہر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ایک دن اپنے پر جبر کیا۔ نشہ کے بغیر چوبیس گھنٹے گزار دیئے لیکن وہ بستر پر لگ گیا۔ وہاں سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بھوک لگتی تھی مگر کھانا بے مزہ لگتا تھا۔ پنڈ کے ڈاکٹر کو اس کی بیماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے شہر جا کر علاج کرانے کا مشورہ دیا۔ اندھا کیا چاہے' دو آنکھیں۔ صمدو نے سوچا۔ "میں شہر جاؤں گا مگر کسی عورت کے فریب میں نہیں آؤں گا۔ وہاں نوری کو تلاش کروں گا اور چرس چھوڑنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔"

وہ بہت کچھ سوچتا مگر کرتا کچھ نہیں تھا۔ شہر میں ایک طوطا پہلوان کے ہاں اس کا ٹھکانہ تھا۔ طوطا پہلوان نے مشورہ دیا۔ "شادی کرلو' بہت سی بری عادتیں چھوٹ جائیں گی۔"

"شادی کیسے کروں؟ میرا ڈیل ڈول اور صورت دیکھ کر کون مجھے پسند کرے گا۔ پنڈ کے سارے گھروں میں رشتہ مانگ کے دیکھ لیا۔ کسی نے لڑکی نہیں دی۔"

"پنڈ ایک چھوٹی سی جگہ ہے۔ چند گھروں میں رشتہ مانگ کر تم مایوس ہو گئے۔ ارے یہاں شہر میں تمہیں ایک سے ایک شریف گھرانے کی لڑکی کا رشتہ مل جائے گا مگر پہلے تم آدمی تو بنو۔"

"آدمی کیسے بنتے ہیں؟ تم مجھے بنا دو۔ میں اچھی خوبصورت لڑکی سے شادی کرنے کے لئے تمہاری ہر بات مان لوں گا۔"

"پہلی بات تو یہ کہ چرس چھوڑ دو۔ ایک بار نہیں چھوڑ سکتے تو آہستہ آہستہ کم کرو۔"

اس نے آدھے سگریٹ کو زمین پر ڈال کر پاؤں سے مسلتے ہوئے کہا۔ "لو سمجھ لو کہ چھوڑ دیا۔ لڑکی کیسی ہے؟"

"میری ایک دور کی رشتے دار ہے بہت خوبصورت ہے۔ گورا رنگ' اونچی ناک' بڑی بڑی کالی آنکھیں' اونچا قد' لانبے بال' تم اسے دیکھتے ہی چت ہو جاؤ گے۔"

اس نے گہری گہری سانس لے کر پوچھا۔ "اتنی حسین لڑکی مجھ سے شادی کرے گی؟ آخر مجھ میں کیا ہے؟"

"تمہارے پاس مکان ہے' زمینیں ہیں' دس بھینسیں ہیں' مگر یہ سب شہر میں ہونا چاہئے۔ وہاں کی زمین بیچو اور یہاں کوٹھی خریدو۔ زیادہ سے زیادہ بھینسیں پالو۔ میں بڑے بڑے ہوٹلوں میں دودھ سپلائی کراؤں گا۔"

"مگر بیوی کا بھینسیں پالنے سے کیا تعلق؟"

"میں تمہیں کاروبار سکھا رہا ہوں۔ لڑکیاں مرد کی خوبصورتی اور بدصورتی نہیں دیکھتیں۔ کاروبار دیکھتی ہیں۔ دولت اور جائیداد کا حساب کرتی ہیں۔ مرد جتنا زیادہ کمائے گا اتنا ہی خوبصورت نظر آئے گا۔"

"مجھے اس لڑکی کی ایک جھلک دکھا دو۔"

"دکھاؤں گا۔ بلکہ جب تک تم اپنی جائیداد شہر منتقل نہیں کرو گے اس وقت تک لڑکی والوں کے ہاں تمہاری رہائش کا بندوبست کرا دوں گا۔ جانتے ہو کیوں؟"

"کیوں؟ جلدی بتاؤ۔"

"اس لئے کہ وہاں رہ کر تم چرس استعمال نہیں کر سکو گے۔ کرو گے تو وہاں سے نکال دیئے جاؤ گے تم سے نشہ چھڑانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔"

وہ سر ہلا کر بولا۔ "جیسا کہ تم نے بتایا ہے' اگر لڑکی ویسی ہی حسین ہے تو تمہارا طریقہ بہت ہی اچھا ہے۔ مجھے کسی کی محبت مل جائے۔ میں زہر پینا چھوڑ دوں گا۔"

طوطا پہلوان کی بیوی نے اسی دن سے رشتے کی بات شروع کر دی۔ ایک ہفتہ بعد لڑکی کے باپ اور بھائی اسے دیکھنے آئے' اسے پسند کر لیا اور باتوں باتوں میں اسے سمجھا

دیا کہ اسے شہر میں رہنا اور کاروبار کرنا چاہئے۔ لڑکیاں دیہاتوں سے شہروں میں آتی ہیں۔ شہروں سے دیہاتوں میں جانا پسند نہیں کرتیں۔ پھر انہوں نے رخصت ہوتے وقت اسے دوسرے دن شام کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔

صمدو کے لئے دوسرا دن جیسے عید کا دن تھا۔ بڑی مشکلوں سے وہ دن گزرا اور کروٹ کروٹ رات بیتی۔ دوسرے دن شام تک وہ بڑا مضطرب رہا۔ طوطا پہلوان کی بیوی اسے سمجھاتی رہی کہ کس طرح سسرال میں سر جھکا کر رہنا چاہئے کم بولنا اور کم کھانا چاہئے لیکن اپنی زمین جائیداد کا ذکر بڑھ چڑھ کر کرنا چاہئے۔

طوطا پہلوان کی بیوی اسے نصیحتیں کرتے ہوئے اسے اس کے سسرال لے گئی۔ اسے اندر سے بڑی بے چینی سی لگ رہی تھی۔ کچھ تو اس لئے کہ اس نے پچھلے دن سے چرس کو منہ نہیں لگایا تھا اور کچھ اس لئے کہ ایک ایسی حسین لڑکی کا دیدار ہونے والا تھا' جو اس کی بیوی بننے والی تھی۔

اس کا سسرالی مکان کچھ پرانا تھا دیواروں کے پلاسٹر ادھڑے ہوئے تھے' اسے ایک کمرے میں بٹھایا گیا۔ وہاں کا فرنیچر بہت پرانا تھا لیکن صمدو ایسے دیہاتی کے لئے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ اس گھر کے مکین اجڑے ہوئے اور اقتصادی بدحالی کا شکار ہیں۔ شریف لوگ ہیں۔ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے معمولی مزدوروں کی طرح اینٹ پتھر نہیں اٹھا سکتے۔ وہ بے غیرت بھی نہیں تھے۔ بے حیائی کی روٹی نہیں کھا سکتے تھے۔ پھر اتنے بڑے سسرالی کنبے میں ان کا گزارہ کیسے ہوتا تھا؟ کیونکہ جوان بچے پڑھتے تھے' باپ بوڑھا تھا۔ کوئی کماتا نہیں تھا؟ ہمارے ہاں بڑھتی ہوئی بے روزگاری' مہنگائی' غربت اور محتاجی نے بڑے بڑے خاندانوں کو زندہ رہنے کے عجیب وغریب ہتھکنڈے سکھا دیئے ہیں۔ وہ بیچارے سسرال والے کیا تھے۔ یہ حقیقت صمدو کو آگے چل کر معلوم ہونے والی تھی۔

وہ پندرہ منٹ تک اس کمرے میں تنہا بیٹھا رہا اور محسوس کرتا رہا کہ [illegible] ازے اور کھڑکیوں سے گھر کی عورتیں اسے جھانک کر دیکھ رہی ہیں۔ پھر ساری کھڑکیاں بند ہو گئیں۔ صرف ایک دروازہ کھلا صمدو نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک نہایت ہی حسین دوشیزہ کھانے کی ٹرے لے کر آ رہی تھی۔ طوطا پہلوان نے اس

کے حسن کی جو تعریف کی تھی وہ کچھ بھی نہیں تھی پہلوان تو کجا' کوئی شاعر بھی اس کے حسن و شباب کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کھانے کی ٹرے کو سینٹر ٹیبل پر رکھ کر کہا۔ "آداب!"

"جی۔ جی ہاں جی.........." صمدو کو یاد نہیں آیا کہ آداب کے جواب میں کیا کہنا چاہئے۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "میں جی پڑھا لکھا بندہ نہیں ہوں۔ بھول چوک ہو جائے تو معاف کر دینا۔"

وہ زیر لب مسکراتی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر بولی۔ "کھانا شروع کریں ہم لوگ ذرا آزاد خیال ہیں مگر ایسے بھی آزاد خیال نہیں ہیں کہ دوسروں کے سامنے بے پردہ چلے آئیں۔ چونکہ آپ کے ساتھ ساری زندگی کے معاملات طے کرنے ہیں اس لئے آپ کے سامنے آ گئی ہوں۔"

وہ آنکھیں پھاڑے' منہ کھولے اس حسینہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ بولی۔ "میرا نام سائرہ ہے میں فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی ہوں۔ میری بڑی بہن طاہرہ سیکنڈ ایئر میں ہے۔ ایک ہمارے چچا زاد ہیں۔ ان کا نام شہزاد ہے۔ وہ ایک برس سے ملازمت تلاش کر رہے ہیں۔ اگر آپ یہاں زیادہ سے زیاہ بھینسیں پالیں گے تو شہزاد ان کا دودھ ضرورت مندوں تک پہنچائیں گے۔ آپ کو یوں بھی اس کاروبار کے لئے دودھ سپلائر کی ضرورت ہوگی۔ شہزاد گھر کے آدمی ہیں۔ کوئی دوسرا ان سے زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہو سکتا کیوں ٹھیک ہے نا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ سائرہ نے کہا۔ "کاروبار میں آمد و خرچ کے لئے ایک منشی کی ضرورت ہوگی میرے ابا یہ کام کر لیں گے اگر آپ کو منظور ہو۔"

وہ جلدی سے سر ہلا کر بولا۔ "منظور ہے میرا کاروبار آپ کا کاروبار ہوگا۔ آپ کو منظور ہے تو مجھ کو بھی منظور ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "آپ بہت اچھے ہیں۔"

صمدو نے شرما کر سر جھکا لیا۔ پھر جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "شادی کب تک ہوگی۔"

"تین سال بعد؟" اس نے پریشان ہو کر سائرہ کو دیکھا ایسا توبہ شکن حسن سامنے ہو اور تین برس انتظار کیا جائے؟ یہ تو قید بامشقت سے بھی زیادہ بامشقت انتظار ہوگا۔

وہ بولی۔ "تین برس بہت لگتے ہیں مگر ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے کافی وقت چاہئے۔ میں کوئی جاہل گونگی لڑکی تو نہیں ہوں کہ ماں باپ نے جس کے ہاتھ میں رسی پکڑائی اس کے پیچھے چلی گئی۔"

"پھر بھی تین برس بہت ہوتے ہیں۔ آپ کچھ کم کریں۔"

"اس سے پہلے میری پڑھائی ختم نہیں ہوگی۔ پھر ابھی تو آپ نے یہاں کوئی زمین اور کوٹھی نہیں خریدی ہے۔ بھینسوں کی بھی زیادہ تعداد ہونی چاہئے۔ ہم روزانہ کم از کم چالیس من دودھ سپلائی کریں گے۔ اتنے گاہک پیدا کرنے کے لئے سال دو سال لگ جائیں گے۔ دیکھئے مجھے جلدی پسند نہیں ہے۔ آپ صبر کرنا سیکھیں۔"

"بات یہ ہے کہ۔ کہ میں آپ کو دیکھ لینے کے بعد آپ سے دور نہیں رہ سکتا۔"

"میں بھی آپ سے دور نہیں رہوں گی۔ آپ ہمارے گھر میں اُدھر سامنے والے کمرے میں رہیں گے۔ اس کمرے میں طاہرہ باجی کے ہونے والے شوہر یعنی میرے دولہا بھائی رہتے ہیں۔ آپ ان کے ساتھ رہیں گے تو میں کبھی کبھی آپ کے سامنے آجایا کروں گی ورنہ گھر کے بزرگ آج کے بعد مجھے شادی سے پہلے آپ کے سامنے آنے نہیں دیں گے۔"

"میں آپ کو ایک نظر دیکھنے کے لئے یہاں رہوں گا۔"

وہ بولی۔ "لیکن ایک قباحت ہے۔ میں بہت خود دار ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے گھر والے بعد میں طعنے دیں کہ آپ شادی سے پہلے اپنے سسرال میں بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔ آپ کی عزت میری عزت ہے آپ یہاں رہنے اور کھانے کے سلسلے میں ماہانہ ایک ہزار روپے دے دیا کریں گے۔"

صمد کا خون خشک ہوگیا۔ ایک ہزار بڑی رقم ہوتی ہے مگر سائرہ کے حسن میں ایسی بڑائی تھی کہ وہ اس کے سامنے خود کو کنجوس ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ڈوبتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ٹھیک ہے کاروبار شروع کرنا ہی ہے کافی آمدنی ہوگی۔ میں ایک ہزار دے دیا کروں گا۔"

"آپ نے ابھی تک کھانا شروع نہیں کیا۔ سالن ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

وہ کھانے لگا اور بار بار دیکھنے لگا۔ اسے اپنی تقدیر پر شبہ تھا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ

اتنی حسین دوشیزہ اس کی بیوی بننے پر آمادہ ہوگئی ہے۔ جتنی صاف گوئی سے معاملات طے ہوئے تھے‘ اس کے پیشِ نظر یہ امید بندھ گئی تھی کہ تین سال کے بعد وہ قیامت خیز مجسمہ اس کی آغوش میں ہوگا۔ پھر اس کی خواہش کے مطابق گورے، گورے خوبصورت بچے پیدا ہوں گے۔ ماں کہتی تھی بس ایک بار خوبصورت بہو خوبصورت بچے پیدا کردے۔ اس کے بعد اس خاندان کی آئندہ نسلیں خوبصورت ہوتی رہیں گی۔

سائرہ کو دیکھتے دیکھتے صمد کو ایک بات کا احساس ہوا کہ اس حسینہ کے حصول کی خواہش اتنی شدید تھی کہ چرس کی طلب نہیں ہو رہی تھی اور وہ چڑیل نوری بھی یاد نہیں آرہی تھی۔

☆======☆======☆

وہ نوجوان مریض بہت بولتا تھا۔ نوری نے اس کے منہ میں تھرمامیٹر رکھ کر کہا۔ "یہ غلط ہے کہ صرف عورتیں بولتی ہیں۔ اب تم ذرا دیر چپ رہو گے۔"

وہ چپ چاپ مسکرانے لگا۔ اس کا نام وسیم احمد تھا پچھلے تین دنوں سے وہ ہسپتال کے بستر پر پڑا تھا۔ بیماری کے باوجود ہنستا بولتا رہتا تھا۔ نوری اپنی ڈیوٹی کے وقت پہلے اس سے کتراتی تھی کیونکہ وہ بڑی بے باکی سے اسے چھیڑتا تھا۔ پہلے ہی دن اس نے پوچھا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

نوری نے جواب دیا۔ "نرس کا ایک ہی نام ایک ہی رشتہ ہوتا ہے۔ سسٹر۔"

"سسٹر بہن کو کہتے ہیں۔ میں تمہیں سسٹر نہیں کہوں گا۔ تم اتنی سوئیٹ ہو کہ ہسپتال سے ڈسچارج ہوتے ہی تمہیں بھگا کر لے جاؤں گا۔"

وہ ایک دم سے پلٹ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ صمدو بھی ایک دن اٹھا کر اسے اپنے گاؤں لے گیا تھا۔ وسیم ڈیل ڈول میں ویسا ہی تھا چہرے پر بڑی مردانگی تھی۔ پہلی ہی بار نوری کے دل نے کہا تھا کہ وہ اٹھا کر لے جاسکتا ہے اور کوئی بھی اس کے ساتھ بھاگ سکتی ہے۔

دوسری بار وہ اسے دوا پلانے گئی تو اس نے پینے سے انکار کردیا۔ نوری نے پوچھا۔ "کیا تم صحت یاب نہیں ہونا چاہتے؟ دوا پی لو۔"

"پی لوں گا۔ پہلے مسکراؤ۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔"

"اگر میری خواہش فضول ہے تو یہاں کا بڑا ڈاکٹر بھی دوا نہیں پلا سکے گا۔"

"بڑے ضدی ہو۔ یہ لو۔"

وہ جبراً مسکرانے لگی۔ اس نے کہا۔ "ہنی! یہ تو بہلانے والی مسکراہٹ ہے۔"

"مجھے ہنی کہہ رہے ہو۔ ہوش میں تو ہو؟"

"تم سر سے لے کر پاؤں تک شہد ہی شہد ہو اور شہد کو ہنی کہا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ابھی تک کسی نے تمہاری قدر نہیں کی۔ اسی لئے تم میرے جیسے قدردان کی قدر نہیں کررہی ہو۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ قدردانی کے لئے دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجتی ہیں جان! تم بہت اچھی ہو۔"

وہ سرہانے کی میز پر جلدی سے دوا رکھ کر وہاں سے بھاگ گئی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ دو برس کے طویل عرصے کے بعد وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ نوجوان مریض صمدو کی جگہ آکر دل میں بیٹھ رہا ہے۔ اسے ہنی کہہ رہا ہے اسے جان کہہ رہا ہے اور اس کی جان لے رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ سرہانے کی میز پر دوا اسی طرح رکھی ہوئی تھی۔ وسیم نے اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ غصے والی صورت بنا کر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ "یہ کیا ضد ہے؟ تم نے دوا کیوں نہیں پی؟ میں ڈاکٹر سے شکایت کروں گی۔"

"میں بھی شکایت کروں گا کہ تمہیں جیون ساتھی بننے سے پہلے مسکرانا نہیں آتا ہے۔"

وہ بے بسی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ "تم جیتے میں ہاری۔ لو اب پی لو۔"

اس نے بدستور مسکراتے ہوئے دوا پیش کی تو وسیم نے ایک سانس میں اسے حلق میں اتار لیا۔ شام کو پھر دوا پلانے کا وقت آیا تو نوری اس کی فرمائش سے پہلے ہی مسکرانے لگی لیکن اس نے دوا پینے سے انکار کردیا۔ نوری نے پوچھا۔ "اب کیا ہوا؟"

"اگر میں اسی طرح دوائیں پیتا رہا تو جلد صحت یاب ہوجاؤں گا۔ ہسپتال سے چھٹی ہوجائے گی۔ میں تمہیں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا۔ میں دوا نہیں پیوں گا۔"

"عجیب آدمی ہو۔ کیا میرے لئے بیمار پڑے رہو گے؟"

"ہاں۔ آزما کر دیکھ لو۔"

"تم نے مجھے پریشان کردیا ہے۔ آخر کیا چاہتے ہو؟"

"تمہیں پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ پہلے وعدہ کرو کہ میری صحت یابی کے بعد بھی مجھ سے ملتی رہو گی۔ تب میں دوا پیوں گا۔"

وہ منہ پھیر کر بولی۔ "اچھا ملوں گی۔"

اس نے نوری کا ہاتھ تھام کر بستر کے سرے پر بٹھالیا۔ اس کے ہاتھوں سے دوا پی۔ اس سے دیر تک محبت میں وفاداری کی باتیں کرتا رہا۔ پھر ڈیوٹی کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ دوسری نرس آنے والی تھی اس لئے صبح آنے کا وعدہ کر کے وہ ہوسٹل کے کمرے میں آ گئی۔

اپنے کمرے میں پہنچتے ہی اس نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ پھر آئینے کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ پھر ایک بار آئینے سے پوچھ رہی تھی کہ آخر اس میں کیا خوبی ہے۔

اس بار آئینے نے سچائی سے بتایا کہ ان دو برسوں میں وہ نکھر گئی ہے۔ اپنے بل پر آزادانہ زندگی گزارنے کے اطمینان اور آسودگی نے اسے صحت مند رکھا تھا۔ کالا رنگ کبھی گورا نہیں ہوتا لیکن اس کا چہرہ نمکین ہو گیا تھا چہرے پر اب ایسی رونق آ گئی تھی کہ اب کوئی بھی اسے نظریں اٹھا کر دیکھ لیتا تھا۔ دیکھ لیتا تھا اور دل میں اس کی تصویر سجا لیتا تھا۔ یہ خدا کی دین ہوتی ہے کہ کالے رنگ میں بھی بلا کی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔

لیکن اکثر لوگ حسن کو سمجھ نہیں پاتے۔ اسے صرف رنگوں میں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ صمدو کم نصیب تھا کہ اس کو سمجھ نہیں سکا اور گورے رنگوں کی چمک دمک میں بھٹکنے چلا گیا۔ اب وسیم جیسا قدر داں پیدا ہو گیا تھا اور اب وہ کتنے برس صمدو کے ہرجائی پن کا سوگ مناتی؟ جوانی کے کٹھن راستوں سے گزرنے کے لئے ایک نہ سہی.......... دوسرے کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔

دوسرے دن وسیم نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ تیسرے دن اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ بہت اچھا لگا لیکن بعد میں نوری نے سوچا کون اچھا لگا؟ وہ کس کے سینے سے لگی تھی؟ تب پتہ چلا کہ وہ ان لحات میں صمدو کے پاس پہنچ گئی تھی۔ صمدو کی دھڑکنوں سے لگی ہوئی تھی۔ ایک پل کے لئے بھی وسیم کی اپنی کوئی شخصیت نہیں تھی۔

ڈیوٹی سے واپس آکر پریشانی سے سوچتی رہی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ صمدو کب تک اس کا پیچھا کرتا رہے گا؟ ہوسٹل کے کمرے میں بیٹھ کر یوں لگ رہا تھا کہ ہسپتال کے اس بستر پر وسیم نہیں صمدو پڑا رہتا ہے۔ اس کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوتی کہ وہ پھر وسیم کے پاس جائے۔ ایک بار پھر اس کے سینے سے لگ کر دیکھے کہ وہ کیا لگتا ہے۔ وسیم یا صمدو؟

رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ ہسپتال گئی۔ ہوسٹل سے پچاس قدم کا فاصلہ تھا۔ اسپیشل وارڈ میں پہنچ کر پہلے اس نے آن ڈیوٹی نرس سے ملنا چاہا۔ نوری نے اس نرس کو بتایا تھا کہ چار نمبر کا مریض اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ لیکن وہ نرس اپنے کیبن میں نہیں تھی وسیم کے کمرے میں تھی۔

نوری اس کمرے کے قریب ٹھٹک گئی۔ نرس کہہ رہی تھی۔ "تم بڑے ہرجائی ہو۔ نوری نے مجھے بتایا ہے کہ تم اس میں دلچسپی لے رہے ہو۔"

وسیم نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ڈولی! کہاں تمہارا چاند سا چہرہ' اور کہاں وہ کالی رات؟ میں صرف تمہیں تمہارے نام سے مخاطب کرتا ہوں۔ کل نوری کہہ رہی تھی کہ میں اسے سسٹر نہ کہوں۔ سسٹر بہن کو کہتے ہیں میں نے صاف کہہ دیا تم سسٹر ہو۔ میں سسٹر ہی کہوں گا..........."

نوری کے سینے پر ایک گھونسہ لگا یہ کیا ہو گیا؟ ابھی تو وہ صمدو کی طرف سے وسیم کی طرف کروٹ بدل رہی تھی اور بستر سے گر پڑی تھی۔ اچانک آنکھ کھل گئی تھی حقیقت سامنے آ گئی تھی کہ بچپن سے پال پوس کر جوان کرنے والا صمدو اسے چھوڑ گیا تھا۔ پھر بھلا دو دن کا مریض سنجیدگی سے کیسے محبت کر سکتا ہے؟

وہ ہوسٹل کے کمرے میں آکر دیر تک روتی رہی۔ اپنے معبود سے شکایت کرتی رہی کہ جب اسے خوبصورت نہیں بنایا تو اسے حساس کیوں بنایا۔ بدصورت کو نفرت برداشت کرنے کا حوصلہ ملنا چاہئے۔ تاکہ وہ ٹھوکریں کھا کر' طعنے سن کر بے حسی سے ہنستی رہے۔ مگر وہ حساس تھی۔ اپنے عورت ہونے کا حق مانگتی تھی اور عورت کے جائز غرور کو ٹھیس پہنچے تو تلملا جاتی تھی۔

بڑی دیر رونے کے بعد اس نے خود کو تسلی دی کہ وسیم کیا اسے ٹھکرائے گا۔ وہ

تو خود وسیم کے سینے سے لگ کر صمدو کے پاس پہنچ گئی تھی اور اس طرح وسیم کی شخصیت کو ٹھکرا چکی تھی۔ اسے بڑی تسلی ہوئی۔ اس نے آنسو پونچھ لئے۔ پہلے ہی صمدو کی اہمیت کچھ کم نہ تھی' اب اور بڑھ گئی۔ اسے ایک نظر دیکھنے کو دل مچلنے لگا۔ اس نے اسی لمحے فیصلہ کرلیا کہ وہ ماں سے ملنے کے بہانے پنڈ جائے گی اگر شازیہ بہو بن چکی ہوگی تو الٹے پاؤں واپس آجائے گی۔ "آہ! دو برس بیت گئے تھے جیسے دو صدیاں بیت گئی تھیں۔ پتہ نہیں پنڈ کے اس چھوٹے سے گھر میں کیسے انقلاب آئے ہوں گے.........

وہ ہسپتال سے چھٹی لے کر ایک دن وہاں پہنچ گئی............ وہی گاؤں تھا' وہی گھر تھا مگر باڑے میں بھینسیں نہیں تھیں۔ باڑہ خالی تھا۔ نوری کو ایسا لگا جیسے اس کا سینہ خالی ہوگیا ہے۔ اسے صمدو کے بعد بھینسوں سے زیادہ محبت تھی کیونکہ وہ دن رات ان کی خدمت کرتی رہی تھی۔ ماں نے اسے اپنے دروازے پر دیکھا تو پہلے وہ پہچان نہ سکی۔ نوری شہر والی لگ رہی تھی۔ سفید چمکتے ہوئے لباس میں وہ ڈاکٹرنی دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔ "اماں میں نوری ہوں۔"

ماں حسرت اور مسرت سے لرز گئی۔ فوراً ہی آگے بڑھی۔ ڈگمگاتی ہوئی آئی اور اس سے لپٹ گئی۔ بوڑھے بازوؤں میں اسے جکڑ کر بولی۔ "ہائے تو کہاں چلی گئی تھی۔ کچھ تو بول کر جاتی۔"

وہ ماں کے گلے لگ کر دور اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ صمدو کو تلاش کر رہی تھی۔ ماں سے بولی۔ "کہاں بول کر جاتی؟ کیوں بول کر جاتی؟ میں جانتی تھی کہ جاؤں گی تو کوئی میرے پیچھے ڈھونڈنے نہیں آئے گا۔"

"بیٹی! شرمندہ نہ کر ہم سے بڑی بھول ہوئی۔ ہم نے تیرا دل دکھایا ہے۔ ہمارے گھر میں کبھی گورے بچے پیدا نہیں ہوں گے۔"

"کیوں گھر میں بہو نہیں آئی؟"

"نہیں بیٹی! وہ تو کنجری نکلی۔ میرے بچے سے پہلوانی چھڑا دی' اسے کہیں کا نہ رکھا۔"

نوری خوشی سے کھل گئی۔ اپنی مسرتوں کو چھپاتے ہوئے وہ صمدو کو پوچھنا چاہتی تھی اس لئے پوچھا۔ "اماں بھینسیں کہاں ہیں؟"

ماں نے ایک ہائے کے ساتھ کہا۔ "صمدو ساری بھینسیں شہر لے گیا ہے۔ آؤ بیٹی یہاں بیٹھو یہ تمہارا گھر ہے اور ہمیشہ تمہارا ہی رہے گا۔"

اس نے پوچھا۔ "کیا بھینسوں کو شہر میں بیچنے لے گیا ہے؟"

"نہیں' وہ اور بھینسیں خرید چکا ہے اور شہر میں دودھ بیچنے کا کاروبار کر رہا ہے۔ اس نے یہاں کی زمین بیچ دی ہے۔ وہاں ایک چھوٹی سی کوٹھی اور بھینسوں کے لئے زمین خریدی ہے۔"

اوہ! اسے شہر کی ہوا لگ گئی ہے۔"

"نہیں بیٹی! آنچل کی ہوا لگی ہے پہلے کنجری سے دھوکہ کھایا۔ اب ایک شریف زادی کے گھر میں شادی سے پہلے گھر داماد بن کر پڑا ہے۔"

نوری کے سینے میں درد ہونے لگا۔ اس نے ٹوٹے ہوئے دل سے پوچھا۔ "وہ بھی گوری چٹی ہوگی۔"

"ہاں۔ بہت خوبصورت ہے۔ مگر بہت پڑھی لکھی' بہت چالاک ہے۔ صمدو مجھے وہاں لے گیا تھا۔ اس کا نام سائرہ ہے۔ جھوٹ کیوں بولوں وہ مجھے بہت پسند آئی مگر اس گھر کے طور طریقے پسند نہیں آئے۔ میں نے صمدو کو سمجھایا کہ جو لوگ شادی سے پہلے گھر داماد بنا رہے ہیں۔ تمہارے کاروبار پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں اور صحیح آمدنی کا پتہ نہیں چلنے دیتے' وہ مخلص اور دیانتدار نہیں ہوسکتے۔ مگر۔ مگر جوانی میں ماں کی نہیں جورو کی بات سمجھ میں آتی ہے۔"

"اماں! وہ نقصان اٹھائے گا تمہیں اس کے ساتھ رہنا چاہئے۔"

"میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ سائرہ کو جلد بیاہ کر گھر لے آ' یا اس کا گھر چھوڑ دے۔ مگر ایک برس چار مہینے گزر گئے سائرہ کی پڑھائی ختم ہونے میں نہیں آرہی ہے۔ سنا ہے ابھی دو برس اور پڑھے گی۔ صمدو ابھی اور دو برس وہاں رہے گا۔ میں سمجھتی ہوں وہ ساری عمر اسی دروازے پر پڑا رہے گا۔ پہلے مجھ سے مہینے مہینے ملنے آتا تھا۔ اب چھ مہینے سے نہیں آیا۔ میں ہی جاتی ہوں مگر اس گھر میں نہیں

جاتی۔ باہر بیٹے سے کھڑے کھڑے مل آتی ہوں۔ بیٹی، کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اس گھر کو تیری ہائے لگ گئی ہے۔"

"نہیں اماں! ایسا نہ کہو۔ یہ یہ میرا گھر ہے اور اپنے گھر کو اپنی ہائے نہیں لگتی۔"

اس نے رات کا کھانا ماں کے ساتھ کھایا۔ دل کہتا تھا کہ صمدو شہر سے آئے گا۔ ماں سے ملنے آئے گا۔ یا ایک بار اور ٹھوکر کھا کر آئے گا۔ وہ پشیمان ہوگا۔ اس کا سر جھکا ہوگا اپنے گھر میں اسے دیکھتے ہی۔ "ہائے نوری!" کہہ کر سہارے کے لئے لپٹ جائے گا۔ پھر وہ اسے اپنے سینے میں چھپالے گی۔

وہ دو برس سے کچھ ایسے ہی خواب دیکھتی چلی آرہی تھی۔ رات کو سونے کے وقت وہ صمدو کے کمرے میں گئی۔ وہاں کی ہر چیز کو جھاڑ پونچھ کر صاف کیا۔ بستر پر دھلی ہوئی چادر بچھائی۔ تکئے کے غلاف بدلے۔ پھر اس ہرجائی کے بستر پر لیٹ کر کروٹیں بدلتی رہی اور ہر آہٹ پر چونکتی رہی۔ رات کے دو بجے محسوس ہوا کہ باہر کوئی ہے اس نے بستر سے اٹھ کر کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ پھر دروازہ کھول کر باہر آگئی۔

باہر برآمدے کے زینے پر بوڑھی ماں بیٹھی رو رہی تھی۔ ایک بار پہلے بھی ایسی ہی چاندنی رات تھی اور نوری برآمدے میں بیٹھی شازیہ کی آمد پر اور صمدو کی بے وفائی پر رو رہی تھی۔ ماں نے بیٹے کی حمایت میں خوبصورت پوتے پوتیوں کو گود میں کھلانے کے خواب دیکھتے ہوئے نوری کے آنسوؤں کو نظرانداز کردیا تھا۔ وقت اپنے آپ کو بڑے ہی عبرت ناک انداز میں دہراتا ہے۔ آج ماں آنسو بہا رہی تھی۔

نوری اس کے پاس جاکر بیٹھ گئی۔ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "اماں صبر کرو۔ اسے پھر ٹھوکر لگے گی۔ وہ پھر واپس آئے گا۔"

ماں نے نوری کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہا۔ "تجھے دیکھ کر رونا آرہا ہے کہ بہو واپس آگئی بیٹا نہیں آیا۔ اس کے انتظار میں، میں ٹھیک سے سو نہیں سکتی۔ پتہ نہیں وہ کب آجائے۔ پتہ نہیں میری آنکھ لگ جائے تو پھر نہ کھلے۔ وہ پکارتا رہ جائے اور میں سوتی رہ جاؤں۔"

"ایسا مت کہو، وہ آئے گا تو میں تجھے جگادوں گی۔ آؤ میں تمہیں سلادوں۔"

وہ ماں کو سمجھا بجھا کر کمرے میں لے آئی۔ ماں نے ایک سوٹ کیس کھول کر ایک

کاغذ کا ٹکڑا نکال کر دیا۔ "بیٹی یہ صمدو کا پتہ ہے شہر میں اسی جگہ رہتا ہے تم واپس جاؤ تو اس سے ضرور ملنا۔"

وہ خود جاکر ملنا نہیں چاہتی تھی۔ گاؤں میں ماں سے ملنے کے بہانے آئی تھی۔ اس نے وہ پتہ رکھ لیا۔ بوڑھی عورت کا دل دکھانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا کر تھپکنے لگی۔ ماں نے کہا۔ "بیٹی! تیرا سینہ بہت وسیع ہے جس میں ساری دنیا کا پیار سما سکتا ہے۔ صمدو نے یہ جگہ چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ اب وہ آئے گا تو میں اس سے جھگڑا کروں گی۔"

اس نے ماں کو تھپک تھپک کر سلا دیا۔ خود جاگتی رہی۔ واپس نہ آنے والے کی یادوں میں کھوئی رہی۔ فجر کی اذان کے وقت اسے ہوش آیا کہ ماں کو آہستگی سے اپنے سینے سے الگ کرنا چاہئے تاکہ آنکھ نہ کھلے۔ اس نے الگ کیا تو دل دھک سے رہ گیا۔ بوڑھا جسم بالکل ساکت تھا۔ آنکھیں کبھی نہ کھلنے کے لئے بند ہو چکی تھیں۔

نوری نے اسی وقت سارے پنڈ والوں کو اس کی موت کی اطلاع دی۔ ایک شخص کو صمدو کا پتہ دے کر شہر بھیجا پھر تجہیز و تکفین کی تیاری ہونے لگی۔ صبح دس بجے صمدو شہر سے آگیا مگر ماں اسے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ نوری کے کانوں میں وہ بوڑھی آواز گونجنے لگی۔ "اس کے انتظار میں، میں سو نہیں سکتی۔ پتہ نہیں وہ کب آجائے۔ پتہ نہیں میری آنکھ لگ جائے تو پھر نہ کھلے۔ وہ پکارتا رہ جائے اور میں سوتی رہ جاؤں۔"

صمدو نے غم سے نڈھال ہوکر بڑبڑانے کے انداز میں کئی بار زیر لب ماں کو پکارا مگر وہ جواب نہ دینے کے لئے سوگئی تھی۔ اسے قبر میں اتارنے کے بعد وہ گھر واپس آیا تو نوری کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پہلے وہ جان بوجھ کر اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔ پرسا دینے والی عورتوں کی بھیڑ میں چھپی ہوئی تھی۔ اب سب جا چکے تھے۔ وہ گھر جو ماں سے خالی تھا، اب نوری سے آباد لگا۔ وہ منہ پھیر کر برآمدے کے زینے پر بیٹھ گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھی عورت ان کے لئے کھانا لائی۔ صمدو اور نوری کے درمیان کھانا رکھتے ہوئے بولی۔ "تیری ماں یہاں تنہائی کا عذاب سہتی رہی۔ یہاں گھر گھر جاکر روتی رہی کہ تو شہر والیوں میں جاکر پھنس گیا ہے۔ بیٹا! اب بھی عقل سے کام لے۔ اپنی نوری سے اچھی تجھے کہیں نہیں ملے گی۔"

وہ سر جھکائے باتیں سنتا رہا۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔ وہ بوڑھی عورت بولتے بولتے تھک کر چلی گئی۔ اس کے بعد نوری نے لباس بدلا' اٹیچی اٹھائی پھر برآمدے میں آکر بولی۔ "دنیا ٹھیک کہتی ہے بھینس کے آگے بین نہیں بجانا چاہئے۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ احاطہ سے گزرنے لگی۔ صمدو نے سر اٹھا کر دیکھا اور سوچا............ "کیسی بھرپور ہو گئی ہے۔ پتہ نہیں چہرے میں بھی کہاں سے اتنی کشش آگئی ہے' شاید میں دو برس بعد دیکھ رہا ہوں۔ اس لئے یہ اچھی اور نئی نئی لگ رہی ہے۔"

نوری نے احاطہ کے باہر آکر پلٹ کر دیکھا۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ صمدو نے جلدی سے نظریں جھکالیں۔ نوری نے اس سے دور جاتے ہوئے اپنے دل کو سمجھایا۔ "اس پر حسن کا جادو چل رہا ہے۔ میں ایسی گئی گزری نہیں ہوں کہ محبت کی بھیک مانگوں' میں اسے محبت کے بغیر زندہ رہ کر دکھاؤں گی۔"

وہ چلی گئی۔ صمدو اسے حدِ نظر تک دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تب اس نے سوچا کہ اسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ دو برس کے بعد ملی اور اس سے باتیں بھی نہ کر سکا۔ کیوں نہ کر سکا؟

اس لئے کہ میں گوری چمڑیوں سے ہارتا جا رہا ہوں اور نوری کے سامنے جھینپ رہا ہوں۔ امید ہے کہ سائرہ میری دلہن بن جائے گی پھر میری جھینپ ختم ہو جائے گی۔ اس وقت میں نوری کے سامنے خم ٹھونک کر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مجھے ایک حسین عورت مل گئی ہے۔

وہ حسین سائرہ کے تصور میں کھو گیا۔ وہ شہر میں اس کے ہاں یوں رہتا تھا کہ رہائش کے لئے سامنے والا ایک کمرہ مل گیا تھا۔ اس کمرے میں ایک امجد صاحب رہتے تھے۔ سائرہ کی بڑی بہن طاہرہ سے امجد کی شادی ہونے والی تھی۔ امجد کا ایک چپلوں کا کارخانہ تھا۔ اچھی خاصی آمدنی تھی۔ وہ بھی صمدو کی طرح اس گھر میں ایک ہزار روپیہ ماہانہ دیتا تھا مگر جب سے دودھ فروشی کا کام پھیل رہا تھا اور آمدنی بڑھ رہی تھی تب سے صمدو ڈھائی ہزار روپے ہر ماہ دے رہا تھا۔ سائرہ نے کہا تھا کہ اس کی خوراک زیادہ ہے۔ وہ ایک وقت میں چھ سات روٹیاں' دو سیر گوشت کھاتا تھا اور صبح و شام

پانچ سیر دودھ پیتا تھا۔

صمدو نے کبھی روپے پیسے کو اہمیت نہیں دی۔ اہمیت صرف سائرہ کی تھی۔ وہ اخراجات کے لئے جتنی رقم مانگتی تھی' وہ دے دیتا تھا لیکن اس کے چچا زاد شہزاد سے نفرت کرتا تھا۔ کیونکہ وہ دودھ کی آمدنی میں ہیرا پھیری کرتا رہتا تھا۔ سائرہ نے سمجھایا کہ وہ شہزاد کو ابھی کچھ نہ کہے ورنہ وہ ان کی شادی میں رکاوٹیں پیدا کرے گا۔ اچھی بلیک میلنگ تھی سائرہ کو دلہن بنانے کے لئے وہ شہزاد کی کاروباری بے ایمانی برداشت کر رہا تھا۔

اصل بات جو چیز جتنی نایاب ہوتی ہے اس کی اتنی ہی طلب بڑھتی ہے۔ سائرہ' ایک تو حسین تھی' دوسرے نایاب تھی' ایک ہی گھر میں رہ کر بھی عید کے چاند کی طرح نظر آتی تھی۔ وہاں پردے کی سخت پابندی تھی۔ سائرہ کالا برقعہ پہن کر کالج جاتی تھی اور طاہرہ سرمئی رنگ کا برقعہ پہنتی تھی۔ جس کمرے میں وہ امجد کے ساتھ رہتا تھا' وہاں ایک کھڑکی باہر کی طرف کھلتی تھی۔ جب سرمئی رنگ کا برقعہ جھلکتا تو امجد کھڑکی کے پاس دیدار کے لئے جاتا تھا۔ جب کالے رنگ کا برقعہ وہاں سے گزرنے والا ہوتا تو صمدو کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو جاتا۔ سائرہ کبھی کبھی نقاب کو ذرا سا ہٹا کر جلوہ دکھاتی تھی پھر بجلی گرا کر چلی جاتی تھی۔

سائرہ کی ادائیں شازیہ کی طرح بازاری نہیں تھیں۔ اس میں بڑی سنجیدگی تھی۔ چہرہ اداس اداس سا نظر آتا تھا۔ کبھی وہ صمدو سے باتیں کرتی تو یوں لگتا جیسے وہ جبراً بول رہی ہو۔ کوئی اس کی پیٹھ پر چابک مار رہا ہو کہ بول اور وہ بولتی جاتی ہو۔ ایک آدھ بار اس کی طرف دیکھ کر صمدو کو یوں لگا جیسے وہ ابھی رونے کے کے بعد آنکھیں پونچھ کر آرہی ہو۔ کئی بار وہ پوچھنے سے رہ گیا اسے کیا دکھ ہے۔ اگر وہ اس گھر میں مظلوم ہستی ہے تو وہ اسے وہاں سے بھگا کر لے جائے گا۔ اس کا حسن عجیب ماتمی سا تھا۔ دل کو گرفت میں لے لیتا تھا۔ صمدو اس کی صورت دیکھ دیکھ کر وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔

اس گھر کے دوسرے لوگ سائرہ سے بالکل مختلف تھے۔ وہ ایسے بدمزاج تھے کہ محلے کے کسی گھر میں نہ جاتے تھے اور نہ اپنے ہاں کسی کو بلاتے تھے۔ صمدو اور امجد پر بھی زور دیتے کہ وہ محلے میں کسی سے دوستی نہ کریں۔ شہزاد کچھ دادا قسم کا آدمی تھا۔

محلے والے اس سے ڈرتے تھے۔ وہ صمدو اور امجد سے بھی ذرا اتڑی دے کر باتیں کرتا تھا۔ امجد اسے برداشت کرلیتا تھا لیکن صمدو سینہ تان کر بولتا تھا۔ اس پر شہزاد کی دھونس نہیں تھی۔ تاہم وہ بھی سائرہ کی خاطر ایک بزدل کی طرح اسے برداشت کر رہا تھا۔

ان حالات کی روشنی میں پتہ نہیں چلتا تھا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ سائرہ سے شادی ہوسکے گی یا نہیں۔ ہوگی تو کب ہوگی؟ اگر اس نے کسی دن شہزاد کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے تو' تو انجام کیا ہوگا؟ ایک حسین دلہن کی سیج پر پہنچنے کا سپنا ٹوٹ جائے گا۔

وہ برآمدے کے زینے پر بیٹھا حسرت سے ادھر دیکھ رہا تھا۔ جدھر نوری جاتے جاتے نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ اسے ایک عورت کی سخت ضرورت تھی۔ وہ ایک ساتھی کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ نوری اسے چٹکی بجاتے ہی حاصل ہو جاتی۔ وہ ابھی آئی تھی۔ ابھی اس کے گلے لگ جاتی مگر وہ دو برس سے شازیہ اور سائرہ جیسی حسیناؤں کے لئے چٹکی بجا رہا تھا۔ اب تھک رہا تھا اور پچھتاوے کے لمحات میں شدت سے نوری کو یاد کرتا تھا۔

اس وقت بھی وہ پچھتا رہا تھا اور وہ آنے والی آکر جا بھی چکی تھی۔

☆======☆======☆

انسان کی زندگی میں خوشی کا حصہ کم ہوتا ہے اور جتنی بھی خوشیاں ملتی ہیں ان میں یاد رہ جانے والی خوشی چند لمحوں کی ہوتی ہے۔ نوری کی زندگی میں یاد رہ جانے والی خوشی اتنی ہی تھی جتنی دیر کبھی صمدو اس کا دیوانہ رہا تھا۔

سارے گاؤں میں چرچا تھا کہ نوری اس کی منگیتر ہی نہیں' محبوبہ بھی ہے' اور وہ نوری کا دیوانہ ہے۔ بعض لوگ اس کی دیوانگی یوں بیان کرتے تھے کہ وہ ڈنڈ پیلتے اور ڈنڈ لگاتے وقت ہانپتے ہوئے ہر سانس میں نوری نوری کہتا ہے' جیسے مجنوں لیلیٰ لیلیٰ کہا کرتا تھا۔

نوری نے شہر واپس آکر یہ طے کرلیا تھا کہ جو راستہ صمدو کی طرف جاتا ہے اس راستے پر اب کبھی نہیں جائے گی۔ کبھی وہ بے مروت اس کا دیوانہ تھا۔ بس اتنی ہی

مختصر سی خوشی کو اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھ کر جی لے گی اور اپنی خوشیاں اور خدمات بیماروں اور دکھی انسانوں کو دیتی رہے گی۔

اس عزم کے ساتھ اس نے اور دو برس گزار لئے۔ اس نے صمدو کو بھول جا... کی کوششیں کرڈالیں۔ کبھی بیتے دنوں کو یاد کیا تو اس طرح کہ وہ تین برس آٹھ ماہ سے تنہا زندگی گزار رہی ہے۔ (یعنی صمدو سے بچھڑے تین برس آٹھ ماہ گزر چکے ہیں) جب وہ ایک برس آٹھ ماہ کے بعد پنڈی گئی تھی تو اماں کا انتقال ہوا تھا۔ وہاں صمدو سے سام... ہوا تھا' اب اتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ سائرہ نے شادی کرلی ہوگی (صمدو کے ساتھ) مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ کسی کو یاد کرنے کی؟ (صمدو کو یاد کرنے کی)

وہ کچھ اسی طرح یاد نہ کرتے ہوئے' یاد کرتے کرتے زندگی گزار رہی تھی۔ ایک شام وہ ہسپتال میں ڈیوٹی کے لئے آئی تو ڈیوٹی چارج دینے والی نرس نے بتایا۔ آگ میں جلا ہوا ایک مریض دس نمبر کے بیڈ پر ہے' پہلے اسے ایک انجکشن لگایا جائے۔ وہ انجکشن تیار کرکے سرنج لے کر وہاں پہنچی تو یکبارگی دل دھڑکنے لگا بستر پر صمدو پہلوان لنگوٹ پہنے چاروں شانے چت پڑا ہوا تھا۔

وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ صمدو آنکھیں بند کئے گہری گہری سانس لے رہا تھا۔ اس کے سینے' پیٹ پسلیوں' رانوں اور بازوؤں پر آبلے پڑے ہوئے تھے۔ چہرہ بھی ذرا سا جھلس گیا تھا۔ بدن کے متاثرہ حصوں پر برنال جیسی دوا لیپ دی گئی تھی۔ نوری نے اس کے بازو میں انجکشن لگایا تو اس نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔

کمرے میں بلب کی روشنی تھی۔ صمدو کو سفید لباس میں پہلے ایک نرس نظر آئی۔ نرس نے سر اٹھایا تو نوری سامنے آگئی۔ وہ ایک آہ کے ساتھ بولا۔ "آہ نوری! یہ تم ہو۔ نہیں' میں۔ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔"

نوری کے دل میں خوشیاں بھر گئیں۔ مگر اس نے بظاہر سنجیدگی سے پوچھا۔ "کیا تم نوری کو خواب میں دیکھتے ہو؟"

صمدو نے آنکھیں بند کرلیں۔ جیسے خواب دیکھ رہا ہو۔ پھر وہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولنے لگا۔ "میں حسین عورت کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا ہوں لیکن جب

سوتا ہوں تو خواب میں نوری کے سوا کوئی نہیں آتی۔ ایسا لگتا ہے جیسے نوری میری گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ میں اوپر سے دوسری عورتوں کے پیچھے دوڑتا ہوں۔ اندر سے وہ لہو کی طرح میری رگوں میں دوڑتی رہتی ہے۔"

نوری نے پوچھا۔ "کیا سائرہ نے بھی تم سے شادی نہیں کی؟"

صمدو نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ پھر حیرانی سے بولا۔ تو۔ تو نوری ہے؟ کیا تو نرس بن گئی ہے؟"

"ہاں۔ تو اتنا بے مروت ہے کہ دیکھ کر بھی نہیں پہچانتا۔"

"مگر تو تو بہت بدل گئی ہے۔ نرس کے لباس میں بہت اچھی لگ رہی ہے۔"

"میں اپنی تعریف نہیں سننا چاہتی۔ میرے سوال کا جواب دے۔ کیا تیرے عشق کی آگ نے تجھے اس طرح جلا ڈالا ہے؟"

"ہاں۔ اس گھر میں آگ لگ گئی تھی۔ سائرہ شعلوں میں گھر گئی تھی میں اسے وہاں سے نکال کر لاتے ہوئے جل گیا۔"

"سائرہ کہاں ہے؟"

وہ تھوک نگلنے کے انداز میں بولا۔ "میرا حلق سوکھ رہا ہے۔ پانی............"

سرہانے دودھ اور پانی رکھا ہوا تھا۔ نوری نے گلاس میں ڈال کر اسے پلانے کے لئے سہارا دیا۔ اس کے سر کے پیچھے ہاتھ لے جا کر اٹھنے میں مدد دی۔ ایک طویل عرصے کے بعد دونوں کے جسم ایک دوسرے سے مس ہو رہے تھے۔ نوری کے سینے میں دل کی دھڑکنیں پاگل ہو رہی تھیں۔ وہ دودھ پی رہا تھا اور دودھ کی طرح اس کے اندر اتر رہا تھا اور دور تک پھیل رہا تھا۔

اتنے میں ایک پولیس انسپکٹر اور دو سپاہی ہسپتال کے ایک ڈاکٹر کے ساتھ وہاں پہنچے۔ ڈاکٹر نے انسپکٹر کو بتایا۔ "یہی وہ مریض ہے۔"

انسپکٹر نے ایک اسٹول پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہارا نام صمد خان ہے؟"

وہ نوری کے سہارے لیٹتے ہوئے بولا۔ "ہاں جی! میرا ہی نام ہے کیا آپ لوگوں نے سائرہ کو جیل پہنچا دیا ہے؟"

"نہیں' اسے پولیس ہسپتال لے جایا گیا تھا۔ وہاں وہ تفصیلی بیان دینے کے بعد مر

گئی۔"

"اوہ۔ بیچاری..........." صمدو نے آنکھیں بند کرلیں۔

انسپکٹر نے کہا۔ "ہم اس کے بیان پر تصدیقی دستخط چاہتے ہیں۔"

"بیان کیا ہے۔ مجھے کچھ معلوم ہونا چاہئے۔"

انسپکٹر نے فائل کھولتے ہوئے کہا۔ "میں پڑھ رہا ہوں' غور سے سنو۔"

وہ پڑھنے لگا' نوری بھی توجہ سے سن رہی تھی۔ سائرہ نے خود تحریری بیان دیتے ہوئے لکھا تھا۔ میں سائرہ زوجہ شہزاد صدیقی بری طرح آگ میں جل جانے کے باوجود ہوش وحواس میں رہ کر یہ بیان قلمبند کررہی ہوں۔ میرے ماں باپ بچپن میں مرگئے تھے۔ میرے چچا انور صدیقی نے میری پرورش کی۔ میں اور چچا کا لڑکا شہزاد بچپن ہی سے ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے تھے۔ جوانی میں ہماری شادی ہوگئی۔

شہزاد میں ایک بڑی خرابی تھی وہ نکما تھا۔ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ شادی کے بعد بھی اس کی ہڈحرامی نہ گئی۔ چچا محنت مزدوری کے قابل نہیں تھے۔ اس مہنگائی کے دور میں بھوکوں مرنے کی نوبت آگئی۔ شہزاد نے ایک آدھ بار چوری کی۔ میں اسے بہت چاہتی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا۔ ایسا کام نہ کرو۔ پکڑے جاؤ گے تو جیل میں بھی جاؤ گے اور خاندان کی عزت بھی مٹی میں مل جائے گی۔ چچی اپنے بیٹے کو بہت چاہتی تھی' وہ مجھے طعنے دیتی تھیں کہ میں پڑھی لکھی ہوں میں ملازمت کرکے گھر کا خرچ کیوں نہیں چلاتی۔

میں ملازمت کی تلاش میں گھر سے باہر جانے لگی۔ ایسے وقت امجد علی میرا پیچھا کرنے لگا۔ دو دن کے بعد ہی ایک بوڑھی عورت امجد علی کے لئے میرا رشتہ مانگنے آئی۔ وہ لوگ مجھے کنواری لڑکی سمجھ رہے تھے۔ بوڑھی مشاطہ نے بتایا کہ امجد علی کا چپلوں کا بہت بڑا کاروبار ہے اور وہ اس دنیا میں تنہا ہے۔ اس روز گھر والوں نے اس مشاطہ کو ٹال دیا اور آپس میں سر جوڑ کر اس نکتے پر غور کرنے لگے کہ اگر گھر کی بہو کو کنواری لڑکی بنا کر پیش کریں تو فائدے اور نقصانات کے کیا امکانات ہیں۔ میں نے یہ سنا تو شہزاد سے روتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم مجھے اپنے نکاح سے خارج کرنا چاہتے ہو؟"

وہ مجھ سے محبت کرتا تھا' اس نے مجھے سمجھایا۔ "دیکھو' میں تو ویسے بھی تمہارا اچھا

زاد ہوں۔ تم امجد کے سامنے مجھے چچا زاد کہو گی' تو نکاح ٹوٹ نہیں جائے گا۔"

چچی نے کہا۔ "ہم اس سے تمہاری شادی نہیں کر رہے ہیں۔ تم روتی کیوں ہو؟"

چچا نے کہا۔ "ہم اسے شادی کا جھانسا دیں گے۔ امجد سے کہیں گے کہ تم چار سال تک تعلیم حاصل کرو گی اور وہ چار سال تک ہمارے ہاں رہے گا۔"

"مگر وہ ہمارے ہاں رہنے کے لئے کیوں راضی ہو گا؟"

شہزاد نے کہا۔ "تم اتنی حسین ہو کہ تمہیں دیکھتے رہنے کی آرزو میں وہ صرف یہاں رہے گا ہی نہیں بلکہ یہاں کے اخراجات بھی پورے کرے گا۔ یہ تم ہم پر چھوڑ دو کہ اسے کیسے بیوقوف بنایا جائے گا۔"

"لیکن شہزاد! محلے والے بتا دیں گے کہ میں اس گھر کی بہو ہوں یہ تم لوگ کیسا ناٹک کھیل رہے ہو؟"

"جیسا بھی ناٹک ہے' تمہیں اس میں اہم رول ادا کرنا ہے۔ ہم ایک ہفتہ کے اندر یہ محلہ چھوڑ دیں گے۔ دوسرے محلے میں گھر لیں گے اس گھر میں تم بہو نہیں بیٹی کہلاؤ گی۔ ہم وہاں کسی سے زیادہ تعلق نہیں رکھیں گے۔"

"لیکن چار سال تک اسے جھانسا دینے کے بعد انجام کیا ہو گا؟ وہ شخص شادی کے لئے ضد کرے گا۔"

شہزاد نے جواب دیا۔ "چار سال بہت دور ہیں۔ چار سال بعد میں اسے راستے سے ہٹا دوں گا۔ کتنی ہی لڑکیاں اپنی عزت کا سودا کر کے گھریلو اخراجات پورے کرتی ہیں۔ ہم تمہاری عزت کا سودا نہیں کر رہے ہیں۔ تم میری بیوی ہو۔ میری پناہ میں رہ کر نہایت شرافت سے امجد کو دھوکہ دیتی رہو گی اور اس گھر میں تمہارا نام سائرہ نہیں' طاہرہ ہو گا۔"

میں مجبور ہو گئی۔ مجھے میری سسرال والے یا ساری دنیا والے مجبور نہیں کر سکتے تھے لیکن رات کو شہزاد نے اپنی آغوش میں لے کر خوب پیار کیا اور مرتے دم تک ساتھ نہ چھوڑنے کی قسم کھائی تو میں امجد کو بیوقوف بنانے پر راضی ہو گئی۔

امجد علی ہماری توقع سے زیادہ بیوقوف نکلا۔ ٹھیک ہی کہتے تھے کہ دنیا میں

بیوقوفوں کی کمی نہیں ہے انہیں بے وقوف بنانے والا چاہئے۔ دوسرے محلے میں امجد ہمارے ہاں رہنے لگا۔ گھر والے کبھی کبھی عادت سے مجبور ہو کر مجھے سائرہ کے نام سے پکارتے تھے۔ ایک دن امجد نے مجھ سے پوچھا تھا کہ یہ سائرہ کون ہے؟ میں نے بات بنائی کہ سائرہ میری چھوٹی بہن ہے۔

میرا یہ جھوٹ میری سسرال والوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا تقریباً ایک سال بعد شہزاد کے ایک دوست طوطا پہلوان کے ذریعے صمدو پہلوان کا رشتہ میرے لئے آ گیا۔ ہم نے صمدو پہلوان کو بھی اسی طرح پھانس لیا۔ ایک برس کے اندر پہلوان کے دودھ کا کاروبار خوب چلنے لگا۔ شہزاد اس کاروبار کے منافع سے ہرماہ ہزاروں روپے غائب کر دیا کرتا تھا۔ صمدو ناراض ہوتا تھا مگر میرے سمجھانے پر موم ہو جاتا تھا۔

چار برس کے دوران میں بڑی مشکلات سے دوچار ہوتی رہی۔ بیک وقت طاہرہ اور سائرہ کا رول ادا کرتی رہی۔ سرمئی برقعہ پہن کر امجد کے سامنے جاتی تھی اور کالے برقعہ میں صمدو کو اپنا چہرہ دکھاتی تھی۔ میں ڈرتی تھی کہ کسی دن بھید کھلے گا تو کیا ہو گا؟

دوسری طرف میری سسرال والے انجام سے بے پروا ہو کر دولت سمیٹ رہے تھے۔ شہزاد کی عادتیں اور بگڑ گئی تھیں۔ وہ جوا کھیلنے اور شراب پینے لگا تھا۔ پھر مجھے پتہ چلا کہ وہ دوسری عورتوں کے پاس جاتا ہے۔ یہ میں برداشت نہیں کر سکی۔ کوئی بھی عورت جو اپنے مرد کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دیتی ہے' وہ قربانیوں کے صلے میں صرف اتنا چاہتی ہے کہ اس کا مرد صرف اسی کا رہے۔ کسی دوسری عورت کی قربت سوتاپے کی آگ لگا دیتی ہے۔

اس بات پر آئے دن ہمارے درمیان جھگڑے ہونے لگے۔ ایک رات شہزاد نے مجھے آغوش میں لے کر سمجھایا چار سال پورے ہونے والے ہیں۔ میں جلد ہی امجد کو کہیں لے جا کر ٹھکانے لگا دوں گا۔ صمدو پہلوان ہے وہ آسانی سے میرے قابو میں نہیں آئے گا۔ میں پھر دوسرے محلے میں مکان لے رہا ہوں تم وہاں امی کے ساتھ رہو گی ہم یہاں صمدو کے سامنے پریشانی ظاہر کریں گے کہ تم گھر چھوڑ کر بھاگ گئی ہو یا تمہیں کسی نے اغوا کر لیا۔ صمدو تمہارا دیوانہ ہے وہ چیخ و پکار کے ذریعے تمہیں بدنام نہیں کرے

گا۔ ہم اسے سمجھائیں گے کہ پولیس میں رپورٹ لکھوانے سے خاندان کی بدنامی ہوگی لٰہذا چپ چاپ اسے تلاش کیا جائے' وہ بیوقوف تمہیں تلاش کرتا رہے گا۔"

میں چاہتی تھی کہ یہ ناٹک اب ختم ہوجائے لیکن مجھے کسی بے گناہ کی ہلاکت منظور نہ تھی۔ میں نے کہا۔ "امجد کے خون سے ہاتھ نہ رنگنا ورنہ میں ساتھ نہ دوں گی۔"

شہزاد نے تسلی دی کہ اسے ہلاک نہیں کرے گا لیکن ایک دن امجد اچانک لاپتہ ہوگیا۔ میں نے شہزاد کو جھنجھوڑ ڈالا۔ "یہ تم نے کیا کیا؟ اب میں کبھی تمہارا ساتھ نہیں دوں گی۔"

اس نے جھڑک کر کہا۔ "بکواس مت کرو۔ تم اسے چار برس تک بے وقوف بناتی رہیں۔ اس کے گم ہونے میں صرف میرا نہیں تمہارا ہاتھ بھی سمجھا جائے گا۔ سائرہ عقل سے کام لو۔ ہمارا یہ دھندا بڑا ہی منافع بخش ثابت ہوا ہے۔ میں دوسری شادی کروں گا ایک لڑکی سے معاملات طے ہوگئے ہیں۔ وہ بھی تمہاری طرح ایسا ہی ناٹک کھیلا کرے گی۔"

دوسری شادی کا سن کر میں آپے سے باہر ہوگئی۔ اس بے مروت کو گالیاں دینے لگی۔ اس رات اس نے میری خوب پٹائی کی۔ میں مار کھا کھا کر دوبارہ بے ہوش ہوئی۔ دوسری بار جب ہوش آیا تو صبح ہو رہی تھی۔ شہزاد اور اس کے ماں باپ ایک کمرے میں بیٹھے صلاح مشورہ کررہے تھے۔ اس کمرے کا ایک ہی دروازہ تھا میں نے اس دروازے کو بڑی آہستگی سے بند کیا۔ وہاں سے گیراج میں گئی۔ میرے اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ میں پٹرول کا ٹن اٹھا کر اس کمرے تک آئی۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں سے کمرے کے اندر پٹرول چھڑکنے لگی۔ پٹرول کی بو پا کر وہ تینوں دروازے کی طرف دوڑے میں نے اسی وقت ماچس کی تیلی سلگا کر کمرے میں پھینک دی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے کمرے کے اندر چاروں طرف آگ پھیل گئی۔

وہ تینوں چیخ رہے تھے۔ دروازہ پیٹ رہے تھے۔ کھڑکیوں میں لوہے کی جالیاں تھیں۔ باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ میں نے اپنے کمرے میں بھی پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ میں نے انتقام لے لیا مگر میں اب بھی شہزاد سے محبت کرتی ہوں اس کے بغیر جینا

نہیں چاہتی لیکن صمدو مجھے آگ کے شعلوں سے نکال کر لے آیا۔ اس نے اچھا ہی کیا چند گھنٹے اور زندہ رہنے کی مہلت دے دی۔ یہ مہلت پاکر میں یہ بیان بہ قلم خود لکھ رہی ہوں اور تادم تحریر ہوش وحواس میں ہوں۔ ہم انسان عجیب ہیں' عبرتناک انجام کو سمجھنے کے باوجود جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ پھر اپنی سزا کو پہنچ کر دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں۔ میری بھی نصیحت اور دعا ہے کہ اللہ کسی کو ایسا انجام نہ دکھائے۔
فقط راقم الحروف! سائرہ شہزاد.........."

انسپکٹر نے فائل بند کرتے ہوئے صمدو کو دیکھا۔ تھوڑی دیر تک ہسپتال کے کمرے میں گہرا سکوت طاری رہا پھر صمدو نے پوچھا.........."کیا وہ مرگئی؟"

"ہاں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "کیا تم اس بیان کو درست سمجھتے ہوئے دستخط کرو گے؟"

"ہاں جی' میرے بارے میں سائرہ نے درست لکھا ہے۔ اپنے بارے میں بھی غلط نہیں لکھ سکتی تھی۔ میں اس کا ماتمی چہرہ دیکھ کر سوچتا تھا کہ وہ بڑے صدمے اٹھا رہی ہے۔ بیچاری.......... میں پڑھنا لکھنا نہیں جانتا۔ کاغذ لائیے۔ انگوٹھا لگا دوں گا۔"

اس نے انگوٹھا لگا دیا۔ انسپکٹر اپنے سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوگیا۔

ڈاکٹر نے نوری سے کہا۔ "تم اتنی دیر سے ایک ہی مریض کے پاس موجود ہو۔ تمہیں دوسرے مریضوں کو بھی اٹینڈ کرنا چاہئے۔"

وہ ڈاکٹر کے ساتھ باہر جاتے ہوئے بولی۔ "آج میں دوسروں کو اٹینڈ کرلوں گی مگر کل سے مجھے لمبی چھٹی چاہئے۔ میں یہ چھٹی صمدو کی تیمارداری میں گزاروں گی۔"

"کیا یہ تمہارا کوئی رشتے دار ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کون ہے یہ؟" ڈاکٹر نے چلتے چلتے رک کر سوال کیا۔

وہ ذرا ہچکچائی۔ پھر سر جھکا کر بولی۔ "میرا منگیتر ہے۔"

ڈاکٹر سر ہلا کر چلا گیا۔ اس دن سے نوری نے تیمارداری کی انتہا کردی۔ اس نے دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ چوبیس گھنٹے صمدو کے بستر سے لگی رہتی۔ کھانے پینے' نہانے دھونے کے لئے ذرا جاتی تھی۔ پھر آجاتی تھی۔ رات کو صمدو کے

کمرے کے ایک بستر پر سوتی تھی اور ذرا سی آہٹ پر اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی۔ صمدو اس کی خدمت گزاری دیکھ رہا تھا اور ندامت سے مرا جارہا تھا۔

اس کے جسم کے آبلے پھوٹ رہے تھے۔ زخم بھر رہے تھے۔ یہ سب کچھ رفتہ رفتہ ہو رہا تھا۔ پھر ایک رات نوری نے بتایا کہ دوسرے دن ہسپتال سے اس کی چھٹی ہو جائے گی۔

اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"اپنے ساتھ کیوں لے جائے گا؟"

"تُو میری ہے۔ اب تیرے بغیر میری زندگی نہیں گزرے گی۔"

"تو نے پہلے بھی یہی کہا تھا۔ اب میری تمنا کرنے سے پہلے تجھے اچھی طرح سوچ سمجھ لینا چاہئے کہ مجھ میں ایسی کون سی بات ہے جس سے تیری کمی پوری ہو سکتی ہے؟ میں خوبصورت نہیں ہوں پھر میری چاہت کیوں پیدا ہو گئی؟"

"میں بتا نہیں سکتا کہ تجھ میں کیا بات ہے۔ بس تُو مجھے دنیا کی ساری عورتوں سے زیادہ خوبصورت لگ رہی ہے۔"

وہ ٹھہر ٹھہر کر پتھر جیسے لہجے میں بولنے لگی۔ "صمدو! مجھے اتنے عرصہ میں یہ معلوم ہوا کہ ہم انسانوں میں کوئی خوبصورت نہیں ہوتا۔ کیونکہ تجھے پنڈ کے کسی گھر سے دلہن نہیں مل رہی تھی۔ میں تیرے لئے دنیا کی حسین عورت تھی۔ حالانکہ میں خوبصورت نہیں تھی۔ صرف تیری ضرورت تھی۔

پھر میں تیرے گھر سے بھاگ کر لاری اڈے پہنچی' وہاں میں اس لئے خوبصورت تھی کہ بالکل اکیلی تھی۔ وہ مجھے آسانی سے چھیڑ سکتے تھے اور آسانی سے مجھے حاصل کر سکتے تھے یعنی مجھ سے ضرورت پوری ہو سکتی تھی۔ لہٰذا میں بدصورت نہیں تھی۔

اگر کسی کی بیوی بیمار ہو یا پورے دن سے ہو اور میں اس کی جگہ کسی کے کام آسکوں تو میں خوبصورت ہوں۔

جب یہ پورا معاشرہ بیمار ہو اور اسے ایک مسکرانے والی نرس کی ضرورت ہو اور میں ان بیماروں کی خلوت میں محبوبہ اور جلوت میں سسٹر (بہن) بن کر رہوں تو میں ایسے حرامی اور دوغلے سماج میں ایک خوبصورت عورت سمجھی جاؤں گی۔

یہاں کسی کے پاس حسنِ نظر بھی نہیں ہے۔ لوگ اپنی اپنی نظر سے نہیں' اپنی اپنی ضرورت کے مطابق کسی کو خوبصورت اور بدصورت سمجھتے ہیں۔ صمدو! اب میں پھر تیری ضرورت بن گئی ہوں اس لئے پھر خوبصورت لگ رہی ہوں۔"

"نوری! تو جو سمجھتی ہے سمجھ لے مگر اب میں تجھ سے شادی کروں گا۔"

"میں شادی نہیں کروں گی۔"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا تیرے دل سے میری محبت ختم ہو گئی ہے۔"

"نہیں۔ میں مر سکتی ہوں' مگر دل سے تیری محبت کو مار نہیں سکتی۔"

"نوری! ایک ایک کر کے سب نے ساتھ چھوڑ دیا۔ کیا تو............ بھی چھوڑ دے گی؟"

"تیرا ساتھ نہیں چھوڑوں گی کبھی تو مجھ سے ملنے آیا کرنا............ کبھی میں تیرے گھر آیا کروں گی۔ ہمارے درمیان گہری دوستی گہری محبت اور نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہو گا لیکن تُو مجھے کبھی ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔"

"یہ تو ظلم ہے میں تجھے سینے سے لگا کر خوب پیار کرنا چاہتا ہوں۔"

"تصور میں تو مجھے جتنا پیار کرے گا۔ میں اتنی ہی خوبصورت نظر آؤں گی۔"

وہ بڑی دیر تک بحث کرتا رہا۔ نوری اسے جواب دیتی رہی۔ دوسرے دن ہسپتال سے چھٹی ہوئی تب بھی صمدو نے اسے لے جانے کی ضد کی۔ آخر اس کے مسلسل انکار سے جھنجلا کر چلا گیا۔ اب اس کا دودھ کا کاروبار خوب چل رہا تھا۔ وہ اپنے شہر کے مکان میں رہتا تھا۔ اس نے غصے میں سوچا تھا کہ اب کبھی نوری سے نہیں ملے گا۔ مگر وہ مجبور تھا نوری کسی نہ کسی بہانے اس سے ملنے گئی تو وہ بھی کبھی کبھی اس کے ہوسٹل جا کر اس سے ملاقات کرنے لگا۔

ایک سال بعد اس نے نوری سے مایوس ہو کر ایک شریف گھرانے کی عورت سے شادی کر لی۔ دو برس کے بعد ایک بچے کا باپ بن گیا۔ پھر ہر دو سال چار سال کے بعد بچے ہونے لگے............ خاندان بڑھنے لگا۔ اس کے تمام بچے نوری کے ہاتھوں پیدا ہوئے تھے۔ وہ سب کی دائی ماں تھی۔ اس کی ضد پر صمدو تمام بچوں کو تعلیم دلا رہا تھا گھر کا کوئی بھی مسئلہ ہوتا تو وہ اس سے ضرور مشورہ لیتا تھا اور اسی بہانے وہ نوری

سے ملتا بھی رہتا تھا۔

اس نے کتنی ہی بار اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ نوری نے بڑے پیار سے اسے ٹال دیا۔ ایک بار اس نے زبردستی سینے سے لگانا چاہا۔ نوری چیخ کر بولی۔ "خبردار! آگے بڑھے گا تو میں چیخنا شروع کردوں گی۔ یہاں سے تجھے بھاگنا پڑے گا پھر میں تجھ سے کبھی نہیں ملوں گی۔"

صمدو کو اس پر بڑا غصہ آتا تھا۔ اور جتنا غصہ آتا تھا' اتنی ہی وہ پُرکشش نظر آتی تھی وہ خیال ہی خیال میں اسے بھنبھوڑتا رہتا تھا۔ اس طرح حقیقت کی دنیا میں جسے بھنبھوڑ نہیں سکتا تھا' اس کی اہمیت بڑھ جاتی تھی۔

رفتہ رفتہ غصہ سرد پڑنے لگا کیونکہ بڑھاپا آگیا تھا۔ بچے جوان ہوگئے تھے۔ نوری نے کہا۔ "اب ہمیں کبھی کبھی ملنا چاہئے۔ تم ہفتہ میں ایک بار میرے گھر آیا کرو۔ بچے جوان ہوچکے ہیں۔ اگرچہ ہم گناہگار نہیں ہیں لیکن وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوجائیں گے۔"

صمدو نے بلا چون وچرا اس کا مشورہ مان لیا۔ اب ایک ہفتہ بعد ملن کی گھڑیاں آنے لگیں تو جدائی اور انتظار میں بڑا مزہ آنے لگا۔ وہ ہر ہفتے اس دن کا بڑی بے تابی سے انتظار کرتا تھا۔ ہر ہفتے میں ایک دن عید ہوتی تھی۔ وہ کھڑی استری کئے ہوئے کلف دار جوڑے پہنے' آنکھوں میں سرمہ لگا کر جوتوں کو پالش سے چمکا کر کبھی پھولوں کا گلدستہ اور کبھی قیمتی تحفے لے کر نوری کے دروازے پر پہنچتا تھا۔ اُدھر نوری قیامت کا سنگار کئے بیٹھی رہتی تھی۔

پھر ایک وقت آیا کہ یہ تکلفات بھی ختم ہونے لگے۔ کیونکہ بہت زیادہ بڑھاپا آگیا تھا۔ نوری کے بال سفید ہوگئے تھے صمدو کی کمر جھک گئی تھی لیکن محبت ہر عمر میں سینہ تان کر چلتی ہے۔ وہ گلبرگ سے اچھرے تک نوری کے گھر پیدل آتا تھا۔ اگرچہ اس کے پاس کار تھی مگر وہ جوان بچوں کے مصرف میں رہتی تھی۔ بسوں میں کبھی بھیڑ ہوتی تھی کبھی تیز رفتار بسیں ایک بوڑھے کے لئے اسٹاپ پر نہیں رکتی تھیں۔ اس لئے وہ چھڑی ٹیکتا ہوا پیدل نوری کے پاس پہنچ جاتا تھا۔

لاہور کی گرمی' برسات اور سردی تینوں ہی موسم غضبناک ہوتے ہیں۔ جب نوری دروازہ کھولتی تو وہ کبھی پسینے میں شرابور ہوتا کبھی بارش سے تربتر نظر آتا اور کبھی

سردی سے تھر تھر کانپتا ہوتا۔ وہ ہر حال میں ہفتہ کی شام کو اپنی محبوبہ کے آستانے پر ضرور پہنچ جاتا تھا۔

جب وہ پسینے میں شرابور ہوکر آتا تو نوری اس کے لئے پنکھا چلادیتی۔ وہ بھیگ کر آتا تو اسے دوسرا جوڑا پہننے کے لئے دیتی اور وہ سردی سے کانپتا ہوا آتا تو اسے ہیٹر کے پاس بٹھا کر وہیں گرما گرم کافی تیار کرتی۔ نوری اس سے اٹھارہ برس چھوٹی تھی۔ مگر اس پر بھی اس قدر بڑھاپا آگیا تھا کہ صمدو کو کافی پیش کرتے وقت اس کے ہاتھ جذبات سے کم اور بڑھاپے سے زیادہ کانپتے تھے۔

صمدو اس کے ہاتھوں سے کبھی پیالی لے کر بولتا۔ "نوری! تُونے اپنی جوانی پر بڑا ظلم کیا۔"

"ایسا نہ کرتی تو آج میں بھی ان عورتوں کے کباڑ خانے میں نظر آتی۔ تُو کسی بھی حسین اور پُرشباب عورت کو دیکھ لے' بڑھاپے تک اس کے چیتھڑے اُڑ جاتے ہیں۔"

"عورت اپنے مرد کے ہاتھوں بوڑھی ہونے میں فخر محسوس کرتی ہے۔"

"ہاں جس عورت کو یہ یقین ہو کہ اس کا مرد اس کا ہے اور جسے یقین نہ ہو اور وہ ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاچکی ہو' اسے نوری بن جانا چاہئے۔"

وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔ اس نے گرم پیالی کو ہونٹ سے لگا کر ایک گھونٹ لیا۔ پھر التجا کی۔ "اب تو ہم بالکل ہی بوڑھے اور ناکارہ ہوچکے ہیں' اب تو اپنا ہاتھ پکڑنے دے۔"

وہ دل ہی دل میں بولی۔ "میں نے ایک طویل جوانی کی قربانی دے کر اپنے مرد کو اپنا دیوانہ بنائے رکھا ہے۔ میں جب تک اس کے لئے نایاب ہوں۔ یہ میرا طلب گار بنا رہے گا۔ میں اپنی آخری سانس تک اس کی ضرورت بنی رہوں گی۔ یہ اپنے بیوی بچوں کو بھول سکتا ہے اپنے آپ کو بھول سکتا ہے لیکن مجھے کبھی نہیں بھلا سکے گا۔"

صمدو نے پیالی کو ہیٹر کے پاس رکھ کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اس کا ہاتھ طلب کیا۔ "نوری! میری جان! باہر بڑی سردی ہے۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدے' مجھے ذرا گرمی پہنچادے۔"

نوری نے اس کی کافی کی گرم پیالی اٹھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اب اسے

غصہ نہیں آتا تھا۔ ایسے وقت وہ مسکرا کر کہا کرتا۔ "اللہ کی قسم تجھ سے زیادہ خوبصورت کوئی نہیں ہے..........."

باہر سرد ہوائیں سائیں سائیں کرتی ہوئی ہڈیوں میں اترتی تھیں۔ اندر نوری کا گمرہ گرم ہوتا تھا کیونکہ وہ ابھی تک صمد کی نظروں میں جوان اور انمول تھی۔ اتنی خوبصورت' اتنی اونچی تھی کہ وہاں تک ہاتھ نہیں پہنچتا تھا۔